دو قومی نظریہ

منہ بولتے حقائق

احمد سعید

نظریہ پاکستان ٹرسٹ

احمد سعید

نظریۂ پاکستان ٹرسٹ

کتاب	:	دو قومی نظریہ: منہ بولتے حقائق
مصنف	:	احمد سعید
ناشر	:	نظریۂ پاکستان ٹرسٹ' لاہور
مطبع	:	نظریۂ پاکستان پرنٹرز' لاہور
مہتمم اشاعت	:	رفاقت ریاض
ڈیزائنر	:	محمد شہزاد یٰسین
کمپوزنگ	:	محمد شاہد گلزار
اشاعت دوم	:	اکتوبر 2009ء
تعداد اشاعت	:	500
قیمت	:	425 روپے

Published by

Nazaria-i-Pakistan Trust

Aiwan-i-Karkunan-i-Tehreek-i-Pakistan,
Madar-i-Millat Park, 100-Shahrah-i-Quaid-i-Azam, Lahore.
Ph. 9201213-9201214 Fax. 9202930 E-mail: trust@nazariapak.info
Web: www.nazariapak.info

Printed at: Nazaria-i-Pakistan Printers,
10-Multan Road, Lahore.Ph: 7466975

ابتدائی کلمات

نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کی غرض و غایت یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے مقاصد اور اس کیلئے دی جانے والی قربانیوں کو اُجاگر کیا جائے' نظریۂ پاکستان کی ترویج و اشاعت کی جائے اور اہلِ وطن بالخصوص نئی نسل کو پاکستان کی نظریاتی اساس اور عظیم تاریخی و تہذیبی ورثے سے متعلق معلومات فراہم کی جائیں۔ان مقاصد کے حصول کیلئے نظریۂ پاکستان ٹرسٹ نے وطن عزیز کی نئی نسل کو اپنی سرگرمیوں کا محور و مرکز بنایا ہے کیونکہ ہماری نسلِ نو ہی ہمارے ملک و قوم کا مستقبل ہے اور ان کے فکر و عمل کو علامہ محمد اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے افکار و کردار کے سانچے میں ڈھال کر ہی ہم اپنے مستقبل کو زیادہ روشن اور محفوظ بنا سکتے ہیں۔اس کے لئے نظریۂ پاکستان ٹرسٹ ایک ہمہ جہت پروگرام پر عمل پیرا ہے جس میں مطبوعات کی اشاعت کا سلسلہ اہم ترین حیثیت کا حامل ہے۔ان مطبوعات کے ذریعے ہم نئی نسل کو نظریۂ پاکستان، تحریکِ پاکستان اور مشاہیر تحریک پاکستان کے افکار و تصورات کے بارے میں نہایت سادہ زبان میں آگہی فراہم کر رہے ہیں اور ان میں اپنے ملک و قوم کے حوالے سے احساسِ تفاخر پیدا کر رہے ہیں تا کہ وہ مستقبل میں اپنی قومی ذمہ داریوں سے زیادہ احسن انداز میں عہدہ برآ ہو سکیں۔

قائداعظمؒ کی بے لوث اور عہد ساز قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں نے جان و مال اور عزت و آبرو کی بیش بہا قربانیاں پیش کر کے اگرچہ پاکستان تو

حاصل کر لیا مگر ہم اسے قائداعظمؒ اور علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کے مطابق اسلامی نظریۂ حیات کا قابلِ تقلید نمونہ نہیں بنا سکے۔ بانیٔ پاکستان کے وصال کے بعد قوم کے نام نہاد قائدین نے ان کے نظریات سے انحراف کو اپنا وطیرہ بنا کر اس ملک کو فوجی و سول آمریتوں کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ کے تصورِ پاکستان اور قائداعظمؒ کی جدوجہد کے باعث اگرچہ ہمیں انگریزوں اور ہندوؤں کے تسلط اور غلبے سے نجات حاصل ہو گئی مگر آج ہم ایک دوسری طرح کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے گئے ہیں جس سے نجات کے حصول کے لئے ہمیں از سر نو قائداعظمؒ اور علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔ صرف اسی طرح ہم وطنِ عزیز کو ایک جدید اسلامی، فلاحی اور جمہوری مملکت بنانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

قائداعظمؒ کی زیرِ قیادت تحریک پاکستان میں طلباء و طالبات نے ہر محاذ پر مسلم لیگ کے ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا اور ان کی شب و روز جدوجہد کے طفیل برصغیر کا ہر گوشہ ''پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ'' کے روح پرور نعروں سے منور ہو گیا تھا۔ بابائے قوم نے بارہا ان کی خدمات کو سراہا تھا اور ان پر اظہارِ فخر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''یہی ہیں وہ مردانِ عمل جو آئندہ ہماری قوم کی تمناؤں کا بوجھ اٹھائیں گے۔'' مجھے قوی اُمید ہے کہ زیرِ نظر تصنیف کا مطالعہ ہماری نئی نسل میں اس عقابی روح کو بیدار کر دے گا جو تحریکِ پاکستان کا طرّۂ امتیاز تھی اور وہ نظریۂ پاکستان کی مبلّغ بن کر پاکستان کو علاقائی، لسانی اور فرقہ وارانہ تعصّبات سے رہائی دلا کر وطنِ عزیز کی کشتی ساحلِ مُراد تک پہنچائے گی۔

(مجید نظامی)
چیئرمین

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر

پیش لفظ

دوقومی نظریہ دراصل قیامِ پاکستان کی بنیاد ہے اور یہ نظریہ بالکل درست ہے۔ قیامِ پاکستان کے پس منظر میں جھانکیں تو ہمیں دوقومی نظریے کی تفصیل، تعریف اور صحیح معنوں میں افادیت جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ دوقومی نظریہ ہی درحقیقت نظریۂ پاکستان ہے۔

نظریۂ پاکستان وہ مطمحِ نظر ہے جس کی بنیاد ایک مخصوص نظریے یعنی اسلام پر رکھی گئی ہے جو اپنی تہذیب ثقافت، اقدار اور روایات اور اپنا سیاسی و معاشی نظامِ فکر رکھتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو اپنی شناخت اور پھر دوقومی نظریہ کی بنیاد پر جُداگانہ ریاست کی ضرورت یوں شدّت سے محسوس ہوئی کہ ان کے ساتھ موجود ایک دوسرے نظریے کے حامل افراد جو مسلمانوں کے توحید اور انسانی مساوات کے نظریۂ حیات کے برعکس بت پرستی اور ذات پات کے قائل تھے' انہیں اپنے اندر جذب کر کے اپنے نظامِ فکر و عمل کا حصہ بنانا چاہتے تھے لیکن اس کے برعکس اس خطے میں بسنے والی ملّتِ اسلامیہ اپنے قومی تشخص اور علیٰحدہ شناخت کو چھوڑنے کے لیے کسی صورت تیار نہ تھی۔ یہ ملّتِ اسلامیہ اپنے نظامِ فکر کو نہ صرف قائم رکھنا چاہتی تھی بلکہ عملی طور پر اس کے ظہور کی بھی خواہش مند تھی۔ دونوں قوموں کے درمیان یہی امتیازی خصوصیات دوقومی نظریے کی بنیاد ہیں جو محض نظریہ ہی نہیں بلکہ روزمرہ پیش آنے والی حقیقت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے فرزندوں نے ایسے علاقوں پر مشتمل علیحدہ ریاست کا مطالبہ کیا، جن میں مسلمان اکثریت میں تھے۔

ایک اللہ، ایک قرآن اور ایک رسول ﷺ کے ماننے والے افراد ایک ایسے رشتے میں بندھے ہوئے تھے کہ اس سے الگ ہونا موت کے مترادف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دوقومی نظریے کی بنیاد پر شروع کی گئی تحریک ایک مردِ مومن کی خداداد بصیرت، انتھک محنت اور پُرعزم حوصلے کی

بدولت منزلِ مُراد تک پہنچی۔

برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کی دیرینہ خواہش تھی کہ ان کی زندگیاں بھی ان ثمرات سے بہرہ مند ہوں جو اسلامی نظامِ فکر کی دین ہے۔ اسلام آزادیٔ فکر وعمل، عدل اور اُخوت و مساوات کا دین ہے اور جس کے نفاذ سے قرونِ اولیٰ کے مسلم معاشروں کو دنیا بھر کے مثالی معاشروں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ برصغیر پاک وہند کے مسلمان بھی اپنی زندگیاں اس عظیم معاشرتی سانچے میں ڈھالنے کے آرزومند تھے اور یہ عظیم معاشرتی سانچہ انہیں ایک علیحدہ اسلامی ریاست کی شکل میں ہی میسّر آ سکتا تھا۔ ہندوؤں کی تہذیب وثقافت، روایات واقدار، مذہب وسیاست اور تاریخ وادبیات مسلمانوں سے یکسر مختلف تھیں۔ ان کے درمیان شادی بیاہ کا ہونا ممکن تھا' نہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کھا پی سکتے تھے۔ یہ دونوں قومیں دو مختلف تہذیبوں کی علمبردار تھیں جو ایک دوسرے کی ضد تھیں۔

ظاہر ہے کہ جب مسلمان اپنی جداگانہ تہذیب واقدار اور مذہب وروایات کے لحاظ سے ایک مختلف تشخص کے حامل تھے تو انہیں اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ آئے دن کے نظریاتی، مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی تصادم سے نجات حاصل کریں۔ یہی علیٰحدہ تشخص کی خواہش دراصل دوقومی نظریے کی اصل ہے۔ یعنی برصغیر جنوبی ایشیا میں مسلمان ہر لحاظ سے ایک علیٰحدہ شناخت اور پہچان کی حامل قوم ہے جس کا کوئی انگ، ڈھنگ یا رنگ ہندوؤں سے مشابہت نہیں رکھتا۔ اسی دوقومی نظریے کی بنیاد پر مسلمانوں نے علیٰحدہ وطن کا مطالبہ کیا، ایک ایسا وطن جس میں اسلامی تہذیب وثقافت کا تحفظ ہو، جو اسلامی معاشرے کی تشکیل کا محور ہو، جہاں ہندوؤں کی تنگ نظری اور معاشی استحصال کا کوئی وجود نہ ہو، جہاں پُرامن فضا میں مسلمانوں کی جان وآبرو اور مال ومتاع محفوظ ہو، جہاں ان کے زبان وادب کی ترویج وترقی میں ہندو تعصب اور تنگ نظری آڑے نہ آتی ہو۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کو سمجھنے کی نوجوان نسل کو اشد ضرورت ہے۔

اس کتابچے میں جہاں دوقومی نظریے کے پس منظر اور افادیّت کے حوالے سے بات

ہوئی ہے وہاں دو قومی نظریے کی تاریخی حیثیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں کوشش کی گئی ہے کہ ان تمام شخصیات کا ذکر کر دیا جائے جن کے حوالے سے تاریخ میں دو قومی نظریے پر مبنی تجاویز ملتی ہیں۔ لیکن یہ ایک ابتدائی کوشش ہے جو یقیناً آنے والوں کے لیے تحقیق و جستجو کے نئے در وا کرنے کا سبب ہوگی۔ اس کتابچے کی تیاری کے دوران مجھے اپنے استادِ محترم ڈاکٹر منیر الدین چغتائی سے رہنمائی ملتی رہی۔ اُن کے ساتھ ساتھ مجھے نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن کے سیکرٹری جناب ڈاکٹر رفیق احمد کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اس تحقیقی کام کی تیاری کے مختلف مراحل میں نہایت مفید مشورے دیے اور وقتاً فوقتاً اہم نکات کی طرف توجہ دلاتے رہے۔ اس کتابچے کی تدوین میں برادرِ محترم جناب منظر علوی کی معاونت بھی شاملِ حال رہی جس کے لئے میں اُن کا شکرگزار رہوں۔

☆☆☆

قومیت کا مفہوم:

دوقومی نظریہ کیا ہے؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟ اور اس کی ابتدا کیسے ہوئی ؟ ان تمام سوالات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ قوم کے معنی و مفہوم کے بارے میں تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔

''انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا'' کے مطابق قومیت کا مفہوم' عام صفات اور متعدد اوصاف کا مرکب ہے جو ایک گروہ کے افراد میں مشترک ہو۔ ایسا گروہ جو نسل' روایات اور مشترکہ مفادات' عادات اور رسوم کا حامل ہو۔ ان میں سب سے اہم چیز ایک دوسرے کو سمجھنے کا عمل ہے۔ اس وجہ سے ان میں آپس میں محبت و الفت پیدا ہوتی ہے اور دوسری اقوام کے لوگ ان کو غیر اور اجنبی محسوس ہوتے ہیں[1]۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے مطابق:

''جذبۂ انفرادیت اور اس کی بقا کی خواہش ہی دراصل ہماری قومیت کی بنیادیں ہیں۔ اس برِ عظیم کے مسلمان چودہ سو سال سے ساتھ رہنے' ایک ضابطۂ حیات کا پابند ہونے' عروج و زوال' ترقی و انحطاط میں شراکت کی وجہ سے ایک قوم بن گئے اور تمام ذیلی اختلافات کے باوجود ان میں صدیوں میں جذبۂ قومیت پرورش پا کر مستحکم ہوگیا۔ اگر یہ جذبۂ قومیت استوار نہ ہوتا تو برِ عظیم کے مسلمان کبھی کے ہندوؤں میں مُدغم ہوگئے ہوتے[2]''۔

ڈیوڈ رابرٹسن نے قوم کو افراد کے ایسے مجموعے سے تعبیر کیا ہے جسے چند مخصوص جذبات نے ملا کر باہم مربوط کر دیا ہو۔ اس کے دو عناصر ہیں: پہلا نسل' دوسرا مذہب لیکن اس کے ساتھ ساتھ مشترکہ لٹریچر سے دلچسپی' ماضی کے مشترکہ کارناموں اور مصائب کی یادیں' رسوم وعقائد' مقاصد اور عزائم افراد کو باہم پیوست و مربوط رکھتے ہیں یعنی ایک قوم بناتے ہیں[3]۔

مختصر یہ کہ افراد کا وہ گروہ جس کا مقصدِ حیات ایک ہو، قوم کہلاتا ہے۔

دو قومی نظریہ ...... تاریخی پس منظر:

حضرت آدمؑ سے لے کر اب تک دنیا میں دو قسم کے انسانوں کا گروہ ہمیشہ سے موجود رہتا چلا آرہا ہے۔ پہلا گروہ وہ ہے جو دنیا میں امن و سلامتی، ترقی و استحکام کا خواہاں ہے۔ دوسرا گروہ شر و تباہی کا علم بردار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی بقا و اصلاح کے لیے اپنے منتخب بندوں یعنی پیغمبروں کی جماعت کو دنیا میں بھیجا تا کہ وہ اپنی سیرت و کردار سے لوگوں کی اصلاح کریں۔ جو لوگ فطرتاً اصلاح پسند تھے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کو سمجھا اور انبیاؑ کے اس عظیم مشن میں ان کا ساتھ دیا لیکن شر پسند جماعت کے افراد نیک لوگوں اور ان کے مشن کو ختم کرنے کے درپے ہو گئے چنانچہ خیر و شر کی یہ جنگ اب تک جاری ہے۔

تمام انبیاؑ اور اولیاؒ نے اللہ کے اسی پیغام کو دنیا میں پھیلایا لیکن نبی کریم حضرت محمد ﷺ چونکہ خاتم الانبیا اور سردار الانبیا ہیں، اس لیے ان کے دین اسلام کی حقانیت اور پیغام تا قیامت رہے گا۔ قرآن کا پیغام صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی باعثِ ترقی و فلاح ہے۔

اسلام کا نظریۂ قومیت:

اسلام کے عالمگیر نظریۂ قومیت کی بنیاد صرف مذہب یعنی اسلام پر ہے۔ اسلام کی نظر میں نسل و زبان، علاقائیت کی بنیادیں اور تمام امتیازات باطل اور غیر ضروری ہیں۔ مدینہ منورہ کی فلاحی ریاست میں اگرچہ یہودی، عیسائی اور بُت پرست رہتے تھے مگر حضور ﷺ نے یہاں جو قوم تشکیل دی، اس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی۔ اس ریاست میں حضرت بلال حبشیؓ افریقہ سے، حضرت سلمان فارسیؓ ایران سے، حضرت صہیب رومیؓ روم سے اور بے شمار صحابہ کرامؓ دنیا کے مختلف گوشوں سے یہاں آئے تھے۔ اسلام سے قبل ان صحابہؓ کا رنگ و نسل، قوم، روایات، طرزِ بود و باش سب مختلف

تھا لیکن دینِ اسلام کی وجہ سے وہ ایک قوم بن گئے ۔اب ان کی پہچان دینِ اسلام تھا۔

مسلمانوں کا واحد ذریعۂ ہدایت: قرآن و سُنّتّ

دنیا بھر کے مسلمان ایک وسیع اُخوّت و بھائی چارے کے احساس میں منسلک ہیں۔وہ ایک نصب العین کو پانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ایک خدا کے عقیدے پر اپنی زندگیاں گزارتے ہیں۔اسلام میں قومیت کی بنیاد رنگ' خون' نسل' جغرافیائی حدود کے ایک ہونے پر نہیں ہے۔اسلام کی دعوت کسی فرق و امتیاز کے بغیر ساری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔اسلام بنی آدم کو خدائے واحد کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے جو کائنات کی تمام چیزوں کا خالق و مالک ہے۔ہر بشر اس کے سامنے جواب دہ ہے۔اسلام کا تقاضا ہے کہ لوگ صداقت' امن' عدل اور سلامتی کی فضا میں اپنی زندگیاں بسر کریں۔کسی شخص کی کسی خاص نسل یا قبیلے میں پیدائش کی اسلام میں کوئی اہمیت نہیں بلکہ اللہ کی نظر میں سب سے اچھا وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: **الکفر** ملّتہ وَاحدہ ''کفر ملّت واحد ہے''یعنی کافر دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں' وہ اسلام کے نظریات کے مخالف ہیں۔اسی طرح مسلمان اپنے مشترکہ نظریۂ اسلام کی وجہ سے ملّتِ واحد ہیں۔گویا آنحضرت ﷺ نے روئے زمین پر بسنے والوں کو دو قوموں اور دو طبقوں میں تقسیم کر دیا: (1) ملّت کفر (2) ملّت اسلام۔اسلام کی عظمت' آفاقیت اور حیران کُن جاذبیت سے ملّت کفر ہمیشہ خائف رہی۔ اسلام سے متعلق ابہام و شکوک پیدا کرنے کے لیے تحریکیں چلیں۔کتابیں' قصے اور فلمیں بنائی گئیں لیکن اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے۔

مسلمانوں کی ہدایت کا واحد ذریعہ چونکہ قرآن وسنّت ہے' لہٰذا اس رو سے بھی دیکھا اور پرکھا جائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۃ کافرون میں دونوں فریقوں کو ایک دوسرے سے متمیز کرنے کے لیے خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے۔خدائے واحد و بزرگ وبرتر نے صاف صاف الفاظ میں ارشاد فرما دیا ہے کہ کافروں کا دین اُن کے لیے اور مومنوں کا دین ان کے لیے۔کہا گیا ہے کہ کہہ دیجیے کہ

جسے تم پوجتے ہو' اسے میں نہیں پوجتا اور جس کی عبادت میں کرتا ہوں اسکی عبادت تم نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے دوقومی نظریے کی بنیاد ازل سے ہی چلی آ رہی ہے۔

ہندو مت کا نظریۂ قومیت:

برصغیر جنوبی ایشیا میں جب ہندو آریا پہلے پہل داخل ہوئے تو ان کے مذہبی تصورات نہایت سادہ تھے۔ انہی تصورات وعقائد کو ان کی مذہبی کتابوں (ویدوں) میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے بعد جو زمانہ آیا' اس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ یعنی برہمنوں کی مذہبی حکمرانی قائم ہوگئی اور انہوں نے اپنی برتری کے جواز میں جو مذہبی کتابیں ترتیب دیں' انہیں برہمنا کہا۔ برہمنا کا بُدھ مت اور جین مت کی کتابوں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں واقعات و حالات کو توڑ مروڑ کر بیان کیا گیا ہے اور قدیم ویدی عقائد میں اس طرح ترمیم کی گئی ہے' جس سے برہمنوں کی پیشوائیت کا تسلسل ثابت ہو۔ اس لیے ان کتابوں میں ہندومذہب کی صحیح نمائندگی نہیں کی گئی۔

ویدوں میں ان بڑی بڑی ارواح کو اُلوہیّت کا جامہ پہنایا گیا جو فطرت اور اس کے مظاہر وقوٰی کی نگران ہیں لیکن ارواحِ سفلی کا' جن سے لوگ ڈرتے تھے اور جنہیں راضی رکھنے کے لیے پوجاپاٹ کرتے تھے' ویدوں میں بھی کوئی ذکر نہیں۔ ویدک مذہب میں ہر اس شے کو معبود قرار دیا جاتا تھا جس سے انسانی ذہن پر ہیبت طاری ہو جاتی ہو یا جس سے خوف اور اُمید کے جذبات وابستہ ہو جائیں۔ زمین' آسمان' پہاڑ' دریا' پودے قابلِ پرستش سمجھے جاتے تھے۔ گھوڑے' گائے' پرندوں اور دوسرے جانوروں سے بھی مرادیں طلب کی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ خود انسان کی بنائی ہوئی اشیا مثلاً ہتھیار' طبل وغیرہ کی عبادت بھی کی جاتی تھی۔

ویدمذہب کی ایک خصوصیت ارواح پرستی ہے۔ اس کا مرکزی تصور یہ ہے کہ عالم میں' ایک یا بہت سی طاقتیں کارفرما ہیں۔ یہ طاقتیں جنگلوں' پہاڑوں' دریاؤں اور بڑے بڑے درختوں کو اپنا مسکن بناتی ہیں۔ ان میں خیر کی نسبت شر کی صلاحیت زیادہ ہے' اس لیے انہیں راضی رکھنا ضروری ہے۔

ہندو مذہب کا بانی کوئی ایک شخص نہیں:

زرتشت، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی مانند ہمیں کوئی ایسی شخصیت نہیں ملتی جس کو ہندوؤں کا رہنما قرار دیا جا سکے یا جس کو اس مذہبی نظام میں مرکزی اہمیّت حاصل ہو۔ اس طرح ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کو بھی کسی ایک شخصیت کی جانب منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ہندو مذہب کے ابتدائی مدارج پر لاتعداد شخصیات کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ چونکہ ہندوؤں کے مذہبی نظام کی تشکیل میں لاتعداد اشخاص کا حصّہ ہے، اس لیے اس میں کوئی واحد عقیدہ نہیں۔ مذہبی قوانین و رسوم و شعائر کی عدم یکسانیت، عقائد کی بوالعجبی، طریقِ عبادت کے اختلاف اور معبودوں کی کثرت کے باعث یہ مذہب ایک گنجان جنگل کی طرح ہے جس میں ہزاروں راستے ہیں لیکن کوئی راستہ صاف اور سیدھا نہیں۔

برصغیر کے حوالے سے یہاں یہ ذکر بھی کر دینا ضروری ہے کہ سکندر اعظم کے یونانی جانشینوں کے عہد میں بہت سے ایرانی ایشیا میں آ کر بس گئے جو سورج کی پرستش کرتے تھے اور برہمنوں نے انہیں اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ انہی کے اثر سے ہندوستان میں سورج اور آگ کی پرستش کا آغاز ہوا۔ ہندو مذہب کی بے یقینی صورتِ حال کا صحیح منظر پنڈت جواہر لال نہرو (1889ء-1964ء) کی رائے سے عیاں ہوتا ہے۔

وہ اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں:۔

> ''ہندومت کے دائرے میں بے حد مختلف اور بعض اوقات متضاد خیالات و رسوم داخل ہیں، اسی لیے اکثر کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنوں میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا[4]''۔

پنڈت نہرو اپنی ایک اور کتاب ''Discovery of India'' میں ہندو ازم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''ہندو ازم بحیثیت ایک عقیدہ کے بالکل مبہم، غیر متعین اور بہت

سے کوشوں والا واقع ہوا ہے جس میں ہر شخص کو اس کے مطلب کے مطابق بات مل جاتی ہے۔ اس کی جامع اور مکمل تعریف ممکن نہیں۔ حتمی طور پر یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ آیا یہ کوئی مذہب ہے بھی یا نہیں' یہ اپنی موجودہ شکل و صورت میں بہت سے عقائد اور رسوم کا مجموعہ ہے [5]''۔

ہندوؤں کی کوئی تاریخ کہیں بھی محفوظ نہیں اور جس قوم کی تاریخ محفوظ نہیں رہتی اس کا قومی تشخص بھی باقی نہیں رہتا۔ مؤرخین کی تحقیق کے مطابق 1200ء سے پہلے ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں ایسی کوئی قابل ذکر کتاب نہیں جس کو تاریخ کی کتاب کہا جا سکے یا کوئی ایسی کتاب جس سے اس ملک کے تاریخی حالات معلوم ہو سکیں۔

ہندوؤں کا جامد طبقاتی ڈھانچہ ہزاروں ذاتوں میں منقسم ہے:

ہندو مذہب یا دھرم کی تمام عمارت انسانی تفریق' چھوت چھات اور توہمات پر کھڑی ہے جس کا بنیادی پتھر ذات پات کا ناقابلِ تقسیم اور ناقابلِ تنسیخ نظام ہے جبکہ عقائد اس میں قانونی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندو مذہب کے مطابق یہ قوم چار ذاتوں پر مشتمل ہے:۔

1- **برھمن** جو برہما کے سر سے پیدا ہوا۔ سر چونکہ جسم کا سب سے افضل اور بہتر حصّہ ہوتا ہے' اس لیے یہ قوم پیدائشی طور پر سب انسانوں سے افضل و برتر سمجھی جاتی ہے۔

2- **کھشتری** جو برہما کے بازوؤں سے پیدا ہوا۔

3- **ویش** جو برہما کے پیٹ سے پیدا ہوا۔

4- **شودر** جو برہما کے پاؤں سے پیدا ہوا اور اچھوت کہلایا۔

ہندوؤں نے ذات پات کی اہمیت و تعریف یوں بیان کی ہے کہ اس کے تحت معاشرہ متعدد خود کفیل اور مکمل طور پر الگ الگ ذاتوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ان ذاتوں کے باہمی تعلقات

مذہب کی روسے مرتبے کے فرق کے مطابق طے ہوتے ہیں [6]۔

ہندو مذہب میں چھوت چھات کا کس قدر عمل دخل ہے' اس کا اندازہ آپ اس بات سے ہی لگالیں کہ وہ اپنی ہی قوم کے چوتھے درجے کے ہندو شودر (Dalit) سے کیا سلوک کرتے ہیں۔

ذیل میں ہندوؤں کا شودروں' غیر ہندوؤں اور خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ اندازِ معاشرت اور ہندو مذہب کی تاریخ اور مخصوص سوچ کے بارے میں مزید وضاحت البیرونی کی معروف کتاب ''کتاب الہند'' کے ایک اقتباس کی روشنی میں بہتر انداز میں ہوسکتی ہے۔ اس سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ برصغیر میں دوقومیں آباد تھیں جن کو بالآخر دوقومی نظریے کی بنیاد پر الگ الگ وطن کی ضرورت کا شدّت سے احساس ہوا۔

البیرونی(973ء-1048ء):

البیرونی جو 1020ء کے لگ بھگ ہندوستان آئے' اپنی کتاب **''کتاب الہند''** میں ہندوؤں کا مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ اور معاشرتی رویے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''مسلمانوں کو یہ ملیچھ (ناپاک) کہتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ مسلمانوں سے ملنا جلنا' شادی بیاہ کرنا' قریب رہنا' مل کر بیٹھنا اور ان کے ساتھ کھانا جائز نہیں سمجھتے۔ اگر کسی مجبوری کے تحت ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ ہاتھ ملانا پڑ جائے تو اپنے ہاتھ پر رومال لپیٹ کر مصافحہ کرتے ہیں۔ صدیوں سے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے دل میں جو نفرت کا لاوا پک رہا تھا' یہ سب کچھ اس کا نتیجہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے' ذلیل و خوار کرنے' نفرت سے دور رکھنے اور قتل و غارت سے نیست و نابود کرنے کو ایک اہم مذہبی فریضہ تصور کرتے ہیں'' [7]۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب اسلام کی بنیاد خدا کے صحیح تصور اور اس کی توحید پر ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مذہب انسانی دماغ کی تخلیق ہو یا جن الہامی مذاہب میں انسانوں نے ذاتی مفاد کی خاطر

تحریف کر دی ہو' اُن میں خدا کا تصور ذہنِ انسانی کا تراشیدہ ہوگا اور چونکہ ذہنِ انسانی محسوسات سے آگے نہیں بڑھ سکتا' اس لیے ان کا تخلیق کردہ خدا بھی اسی قالب میں ڈھلا ہوا ہوگا۔

ہندو مذہب میں سانپوں کی پرستش' بانجھ گائے کے بالوں اور کھروں کو سجدہ' گھوڑوں اور گھوڑوں کے مالکوں کو سجدہ' نائی کے اُسترے اور سردی سے چڑھنے والے بخار کو سجدہ کرنے کی تلقین موجود ہے۔

برصغیر میں اسلام کی آمد' تبلیغ دین اور دو قومی نظریہ:

زمانۂ قدیم سے اہلِ عرب کے مشرقِ قریب اور مشرقِ بعید سے تجارتی روابط قائم تھے۔ قبل از اسلام عربوں کے تجارتی جہاز جنوبی ہندوستان کی بندرگاہوں سے گزرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں ہندوستان پر حملے کیے گئے۔ حکم بن ابی العاص نے بحری بیڑا تیار کر کے تھانہ اور بھڑوچ پر حملے کیے۔ بحریہ کے لیے وسائل اور تجربہ کم ہونے کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے بحری جنگوں کی مخالفت کی لیکن جب حضرت عثمانؓ کا دور آیا تو انہوں نے سندھ کی فتوحات میں بہت دلچسپی لی۔ وہ سندھ کے حالات سے مکمل واقفیت رکھتے تھے۔

عرب جنوبی ایشیا میں آباد تھے۔ تجارت پیشہ لوگ اس وقت اہلِ عرب سے باہمی تجارت کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ عرب تاجروں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں ساحلِ سمندر کے کناروں پر آباد تھیں۔ مکران کے ساحلوں سے لے کر ساحلِ مالابار تک عرب تاجروں کے مقامی آبادی سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ برصغیر میں اسلام کی شروعات تقریباً اُسی دور میں ہوگئی تھی جب مکہ مکرمہ میں پیغمبرِ آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے کوہِ صفا پر جا کر اہلِ مکہ کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ ساحلِ مالابار پر آباد عرب تاجروں کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے عرب سے آنے والے دوسرے تاجروں سے حالات معلوم کیے اور اسلامی اخلاق اور اسلامی معاشرے کی بنیاد ڈالی۔ برصغیر میں ساحلوں پر موجود عرب تاجروں کو مقامی آبادی نے ''موپلا'' یعنی دولہا بھائی کا نام دے رکھا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عرب تاجروں کی شرافت

اور دیانتداری کی وجہ سے مقامی لوگ ان کی قدر ومنزلت کرتے تھے' دوسرے ہندوؤں کے معزز گھرانے ان ''موپلوں'' سے اپنی لڑکیوں کی شادی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ساحلِ مالابار کے لوگ ان علاقوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمرانوں کو سامری کہتے تھے۔ ساحلِ مالابار کی ریاست کا ایک سامری جس کا نام پیرومل تھا' مسلمانوں کے اخلاق اور شرافت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا اسلامی نام عبدالرحمٰن رکھا گیا۔ اپنی حکمرانی کے دوران ہی عبدالرحمٰن حج کے لیے روانہ ہوا مگر مکہ پہنچتے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ عبدالرحمٰن واپس نہ لوٹا تو یہ ایک روایت بن گئی کہ جو بھی مملکت (مالابار) کے تخت پر بیٹھتا' وہ برسرِ عام یہ اعلان کرتا کہ جب تک چچا عبدالرحمٰن مکہ سے حج کر کے واپس نہیں آ جاتا' اس وقت تک وہ تخت پر بیٹھے گا۔ ان حکمرانوں نے اسلامی طرزِ حکومت اختیار کرتے ہوئے جنوبی ایشیا کی سرزمین پر ایک نیا اور انوکھا معاشرہ ترتیب دیا۔ یقیناً اس وقت کے مطابق جنوبی ایشیا کے لوگوں کے لیے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اس طرح برصغیر میں ریاست مالابار غالباً وہ پہلا مقام ہے جہاں پہلی مرتبہ برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیب نے جنم لیا۔

مسلم فاتحین و صوفیائے کرام کی آمد

ساحلِ مالابار کے بعد برصغیر میں اسلامی تہذیب کا دوسرا دور 712ء سے شروع ہوتا ہے جب محمد بن قاسم نے مکران کے ساحلوں کے ساتھ واقع دیبل فتح کیا اور یوں برصغیر اسلامی اصولوں اور اسلامی مساوات سے متعارف ہوا۔ تقریباً تین سو سال تک اسلامی تہذیب آہستہ روی کے ساتھ ان علاقوں میں پروان چڑھی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ تبلیغ اسلام کو بہت ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سندھی امیروں کے نام خطوط لکھے جن میں انہیں اسلام کی دعوت دی گئی۔ ان کی دعوت پر جو سندھی اُمرا مشرف بہ اسلام ہوئے' ان میں راجہ داہر کا فرزند جے سنگھ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس دوران بہت سے مدوجزر آئے۔ تقریباً تین سو سال کے بعد ایک بار پھر محمود غزنوی نے برصغیر میں ہلچل مچا دی اور برصغیر پر 17 حملے کیے جس سے بعد ازاں سلطان محمد

غوری کے دور میں اسلامی تہذیب کی حامل مسلمانوں کی پہلی با قاعدہ حکومت کی برصغیر میں داغ بیل پڑی۔ مسلمان برصغیر پاک وہند میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ ان میں ایرانی' افغانی' ترکی' تورانی جیسی مختلف النسل اقوام کے افراد شامل تھے۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد عربی' افغانی' مصری اور دیگر اقوام کے افراد برصغیر میں آتے رہے جو یقیناً مختلف النسل تھے اور برصغیر کے اسلامی معاشرے میں ضم ہوتے رہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسلام کسی قسم کی تفریق اور ذات پات کی تمیز پر یقین نہیں رکھتا اور نہ ہی کسی امتیازی نسلی رشتے سے اس کا کوئی واسطہ ہے۔ یہ مختلف النسل اقوام ہندوستان میں آباد ہو گئیں جنہوں نے دراوڑوں یا آریاؤں کی مانند یہاں کی مقامی آبادی کو نقل مکانی پر مجبور نہیں کیا بلکہ اسلام کے آفاقی اصولوں پر مبنی ایسا معاشرہ تشکیل دیا جس نے یہاں کی مقامی آبادی کو مسلمانوں کی جانب متوجہ کیا۔

اسلام میں برتری صرف اس کو حاصل ہے جو نیک اور پاکباز ہو۔ اسلام نے ایک ایسا ضابطۂ حیات فراہم کیا ہے جو راستی' انصاف' مساوات' رحمدلی اور برداشت کے اصولوں پر مبنی ہے۔ برصغیر میں ہندو قوم نے اب تک وارد ہونے والے تمام فاتحین کو اپنے اندر اس لیے جذب کر لیا تھا کہ وہ تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے تہی دست تھے۔ اس کے برعکس مسلمان اپنا تمدنی نظام اور فلسفۂ حیات رکھتے تھے۔ مسلمانوں کا اپنا جداگانہ تشخص تھا۔ اس لیے برصغیر میں دو جداگانہ تہذیبیں پرورش پانے لگیں۔ اس کے باوجود مسلمان فاتحین نے برصغیر کی غیر مسلم آبادی کو زیادہ سے زیادہ مراعات دیں اور ان کی فلاح وبہبود کے لیے بہترین اقدامات کیے۔

اسی دوران برصغیر میں اشاعتِ اسلام اور مسلم معاشرے کی تشکیل کے لیے دور دراز کے علاقوں سے صوفیائے کرام ہجرت کر کے آئے جن کے حسنِ اخلاق اور نیک سیرت کو دیکھتے ہوئے بعض ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا۔ مسلمان قوم برصغیر میں مساواتِ انسانی اور عدل و اُخوّت کا عظیم پیغام لائی۔ اسلام چونکہ رنگ ونسل' زبان اور جغرافیے کی تفریق وامتیاز نہیں کرتا' اس لیے مردم گزیدہ مخلوق اس کے دامن میں پناہ لینے لگی۔ اسلام کی تحریک نے صدیوں کی ٹھکرائی

ہوئی انسانیت کو ایک انقلاب سے روشناس کرایا۔ اسلام کی وجہ سے مقامی آبادی میں فکری شعور اور مقصدیت جنم لینے لگی جس سے ان کے طرزِ فکر اور طرزِ معاشرت میں نمایاں تبدیلیاں آنے لگیں، یعنی ہندوؤں کی ذہنی آسودگی نے ارتقائی سفر طے کیا۔ مسلمانوں نے اپنی فنی مہارت' جمالیاتی حس اور جوشِ عمل سے قطب مینار' لال قلعہ' تاج محل آگرہ' موتی مسجد اور بادشاہی مسجد جیسی لازوال عمارتیں تعمیر کروائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلم فاتحین نے ہندو رعایا سے برابری بلکہ رواداری کا سلوک کیا۔ مسلمان حکمرانوں کی انصاف پسندی کا زندہ ثبوت بنارس' متھرا اور پورے برصغیر میں پھیلی ہوئی ہندوؤں کی عمارتیں اور خاص طور پر عبادت گاہیں ہیں۔

مسلم حکمران جب تک مضبوط رہے اور ان میں قوت اور صلاحیت رہی' غیر مسلم طاقتیں ان کی فرمانبردار رہیں لیکن جب مسلم فاتحین میں انحطاط کے آثار نمودار ہوئے' مشرکوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی میں 1761ء میں ایک اہم موڑ آیا جس سے ان کی بقا اور سلامتی کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا۔ اسلامی حکومتوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرہٹے' جاٹ اور سکھوں نے مسلمانوں کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ برصغیر کے مسلمانوں میں مرکزیت ختم ہونے کے سبب اُن کی سیاسی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ روہیل کھنڈ' جنوبی ہند' حیدرآباد' بنگال' اڑیسہ اور پنجاب میں چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں تھیں۔ مرکزی حکومت کا دائرۂ عمل صرف دہلی کے لال قلعے تک محدود تھا۔

ان حالات میں ایک مردِ خدا حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے مسلمانوں کی راہنمائی کا بیڑا اٹھایا۔ آپ نے ملکی حالات کا جائزہ لیا اور یہاں کے حکمرانوں میں جہاد کی صلاحیت نہ پا کر احمد شاہ ابدالی کو مسلمانوں کی مدد کرنے پر آمادہ کیا۔ احمد شاہ ابدالی ہر قسم کے مالی فوائد سے بے نیاز ہو کر صرف جذبۂ جہاد کے تحت 1761ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوا۔ پانی پت کی تیسری جنگ میں اگرچہ مسلمانوں کو عظیم فتح حاصل

ہندوؤں کی سرشت میں چالا کی عیّاری' بغض' کینہ پروری' دھوکا دہی سب کچھ شامل تھا جس کا انہوں نے ہر موقع پر اظہار کیا۔ انہیں جب مسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنے مفادات کا تحفظ کرنا ہوتا تو انگریز کے خلاف ہوجاتے اور جب انگریز کو بلیک میل کرنا ہوتا تو مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کو بھڑکاتے اور اپنا مفاد حاصل کر لیتے۔ انگریزوں کی وہ حد درجہ خوشامد کرتے۔ انگریز ہندوؤں کی اس خوشامد سے پوری طرح واقف تھا۔ یاد رہے کہ کانگریس نے برطانوی وزیرِاعظم گلیڈسٹون کی سالگرہ منائی تھی۔ اس سے بڑھ کر انگریز کی خوشامد اور کیا ہوگی؟

اسلامی حکومت کے خاتمے نے مسلمانوں میں سیاسی فوقیت' اخلاقی عظمت اور معاشی حالت کو انتہائی کمزور کر دیا تھا۔ اس سانحہ نے مسلمانوں کو حقیقی طور پر متاثر کیا۔ ہندو تو شروع ہی سے غلامی کے عادی تھے' اس لیے ان کو اس کا قطعاً احساس نہ ہوا۔ مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ شاندار ماضی اور اپنے اسلاف کے عظیم کارناموں اور تہذیبی اقدار کو بھول جائیں اور کفر کی حاکمیت کو قبول کر لیں۔ اس عالم مایوسی میں اللہ تعالیٰ نے سرسید احمد خان جیسی شخصیت کو منتخب کیا جس نے مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دیا۔ آپ نے علیگڑھ میں دینی و دنیاوی تعلیم کا آغاز ایک ساتھ کیا۔ آپ کی تحریک نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی چالوں اور انگریزوں کے حملوں سے محفوظ رکھا اور مسلمانوں میں سیاسی و تعلیمی شعور بیدار کیا۔ علیگڑھ کے تعلیم یافتہ مسلمان تحریکِ پاکستان کے قائدین بنے جنہوں نے ہندو مہا سبھا نامی متعصب ہندو جماعت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

اسی دوران برصغیر میں انگریزوں نے مغربی جمہوریت کو اپنے مفادات کے حصول کے لیے متعارف کروایا اور یوں ہندوؤں کو یہ باور کرایا کہ برصغیر میں دیگر اقلیتوں کے مقابلے میں وہ اکثریت میں ہیں۔ لہٰذا حکمرانی کا پہلا حق انہی کا ہے۔ ہندوؤں کو یہ بات پوری طرح سمجھا دی گئی کہ عددی اکثریت کے بل بوتے پر وہ انگریزوں کے توسط سے ہی اقتدار حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اپنی پالیسی کا مرکز برصغیر میں حصولِ اقتدار کو ہی بنایا اور وقت کے ساتھ ساتھ اقتدار کے

حصول کے لیے، گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہے۔ ہندوؤں کو مسلمان حکمرانوں کی وہ تمام مہربانیاں جو ہزار سال پر محیط تھیں، ظلم وستم لگنے لگیں اور انہوں نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف زہر اُگلنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں انہیں انگریز حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل رہی جس کا ثبوت دیگر تنظیموں اورتحریکوں کے علاوہ آل انڈیا نیشنل کانگرس کا قیام بھی تھا جسے حکومتِ برطانیہ کے ایما پر ایک انگریز لارڈ ہیوم نے ہندوؤں کے مفادات کے حصول کے لیے قائم کیا تھا۔ ہندوستان میں جتنی بھی ہندو تحریکیں قائم کی گئیں وہ سوراج (آزادی) کے حصول کی تحریکیں کم تھیں اور مسلمانوں کو شُدھ کرنے کی زیادہ۔ ہندو مہا سبھا، دیوسماج، آریہ سماج، شدھی اور سنگھٹن کے علاوہ ان کی تعلیمی تحریک ودیا مندر اور واردھا سکیم کا مقصد بھی یہی تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو ہندومت میں شامل کیا جائے۔ کانگریس کے رہنماؤں کے بیانات کہ مسلمان بدیسی ہیں، اس لئے وہ یا تو ہندوستان سے نکل جائیں یا دوبارہ ہندومت میں شامل ہو جائیں، اس بات کی بار بار تصدیق کرتے ہیں کہ ہندوستان کی تمام کی تمام تحریکوں کا پس منظر محض اس میں پوشیدہ تھا کہ وہ ہندوستان کی آزادی میں کسی دوسرے کو شریک کرنے کے لیے تیار نہیں تھے:۔

ہندوؤں اور اُن کے بڑوں کے نزدیک مسلمان یا تو عرب حملہ آوروں کی اولاد تھے یا وہ لوگ تھے جو ہندوؤں میں سے تھے لیکن ان سے الگ ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کے نزدیک انہیں اپنے ساتھ ملانے کے لیے یہ تین طریقے مناسب سمجھے جاتے تھے:

1- مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کر کے ہندو دھرم میں لایا جائے؛
2- مسلمانوں کو ان کے قدیم ملک عرب میں واپس بھیج دیا جائے؛
3- یہ ممکن نہ ہو تو انہیں غلام بنا کر رکھا جائے۔

مسلمانوں سے ہندوؤں کی منافرت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ہندو، مسلمان سے ہاتھ ملانا بھی پاپ سمجھتا تھا۔ اگر مسلمان کے ہاتھ کسی ہندو سے مس بھی ہو جاتے تو وہ اس وقت تک چین نہ لیتا تھا جب تک اچھی طرح گنگا جل (دریائے گنگا کے پانی) سے اسے دھو نہ لے۔ بدقسمتی

سے اگر کوئی مسلمان کسی ہندو کے برتنوں کو چھو لیتا تو یہ برتن اس کے لیے بھرشٹ (ناپاک) ہو جاتے۔ یہاں تک کہ ریلوے سٹیشنوں اور دیگر اجتماعی مقامات پر علیٰحدہ علیٰحدہ پانی ہوا کرتا جسے ہندو پانی اور مسلم پانی کہا جاتا تھا (ہندو مسلم پانی کی یہ صورت حال آج بھی ہندوستان میں موجود ہے)۔ بھولے سے کوئی مسلمان کسی ہندو کے گلاس میں پانی پی لیتا تو بے چارے مسلمان کو جان کے لالے پڑ جاتے۔ غرض مسلمان ہندوؤں کے لیے اچھوت کا سا درجہ رکھتے تھے۔ ہندوؤں کے نزدیک ہندوستان میں رہنے والے مسلمان چونکہ شودروں سے مسلمان ہوئے تھے' اس لیے وہ بھی شودروں کی طرح تھے۔

ان حالات کے تناظر میں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سیاسی میدان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہوگا۔ اس سلوک کی ایک جھلک کانگرسی حکومتوں کے دور میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مختصراً یہ کہ 1937ء کے انتخابات کے نتیجے میں بننے والی کانگریسی وزارتوں نے تعصب اور تنگ نظری کی انتہا کر دی تھی۔ ہندوؤں نے اقتدار کے نشہ میں بدمست ہو کر مسلمانوں پر وہ ظلم و ستم ڈھائے کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ انتہائی حقارت آمیز سلوک روا رکھا گیا اور جگہ جگہ ان کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔

ایسے میں کانگریس کے تین رنگے جھنڈے (ترنگے) کو سرکاری پرچم کی حیثیت دے دی گئی۔ سرکاری عمارتوں پر لہرائے جانے والے اس ترنگے (جھنڈے) کے آگے جھکنے پر ہر مسلمان مجبور تھا۔ بندے ماترم کے رسوائے زمانہ ترانے کو سرکار کی سرپرستی حاصل ہوگئی اور ہر مسلمان کو متعصب خیالات پر مبنی اس گیت کو پڑھنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ہندی اردو تنازع کو مزید ابھارا گیا اور اردو کا تشخص ختم کرنے کے لیے ہندی کی سرپرستی کی گئی۔ اس سے پہلے 1867ء میں بھی بنارس میں ہندوؤں کی طرف سے ہندی زبان مسلّط کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اب موقع ملتے ہی ہندوؤں نے پوری قوت سے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا اہتمام کر دیا۔ جگہ جگہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا گیا۔ گائے کے ذبیحہ پر پابندی عائد کر دی گئی

حالانکہ مسلمانوں کے نزدیک گائے ایک حلال جانور ہے اور اس کا گوشت کھانا ہر طرح سے جائز ہے لیکن ہندوؤں نے انتہائی متشدّد انداز میں گائے کے ذبیحہ کو روکا اور مسلمانوں کو زہر آلود خنجروں کا نشانہ بنایا۔

تعلیم کے حصول کو **واردھا سکیم** کا نام دیا گیا اور سکولوں کا نام **ودیا مندر** رکھ دیا گیا۔ سکولوں میں گاندھی کی مورتی بغرضِ پوجا رکھی گئی۔ مسلمان بچوں کو بھی اس مورتی کے آگے جھکنا پڑتا۔ گویا مسلمانوں کو ہر طرح سے مجبور کیا گیا کہ وہ ہندو ثقافت اور تہذیب کو اختیار کریں۔ اگر مسلمان مزاحمت کا طریقہ اختیار کرتے تو پُر تشدد کارروائیوں میں ان کی جان، مال اور عزت و آبرو کو ہدف بنایا جاتا۔

کھلے عام اسلامی عبادات اور شعائر کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ مساجد کے باہر ناقوس اور ڈھول بجائے جاتے۔ مسلم تہواروں خصوصاً عید الفطر اور عید الاضحیٰ پر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فسادات کی آگ بھڑکا دی جاتی۔ مسلمانوں کے مقدس مزارات اور قرآن مجید کی بے حرمتی کے دل سوز واقعات کثرت سے ہونے لگے۔ معاشی اعتبار سے بھی مسلمانوں کو زک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی تاکہ وہ معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کے بوجھ تلے دب کر اپنے عقائد سے بھٹک جائیں اور ہندومت کے جال میں پھنس جائیں۔

مسلمان پہلے ہی معاشی اعتبار سے پسماندگی کا شکار تھے، اس پر مستزاد یہ کہ معاشی اعتبار سے مسلمان جن شعبوں سے منسلک تھے یا جو کاروبار اختیار کیے ہوئے تھے، ان پر بھاری محصولات اور ٹیکس عائد کر دیئے گئے۔ یہ ٹیکس اور محصولات جبری طور پر وصول کیے جاتے۔ نتیجتاً مسلمان روز بروز معاشی لحاظ سے کمزور ہوتے گئے جبکہ دوسری طرف ہندوؤں کو ہر طرح سے نوازنے کی کوشش کی گئی۔ حکومت کے اعلیٰ مناصب پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ ان حالات میں مسلمان انتہائی کسمپرسی کی کیفیت سے دوچار ہو گئے۔

مسلمانوں کی بے یار و مددگاری پر مبنی یہ حالات عرصۂ دراز سے چلے آ رہے تھے۔

اس پر 1937ء میں بننے والی ظالم کانگرسی وزارتوں نے انتہا کر دی۔ایسی صورتِ حال میں کیونکر ممکن تھا کہ مسلمان اس خوش فہمی کا شکار رہوں کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مستقل طور پر رہ سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ 1937ء سے کہیں پہلے مختلف مفکرین اس اظہر من الشمس حقیقت کا ادراک کر چکے تھے۔ان کے نزدیک مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک جگہ رہنا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

دو قومی نظریہ: سال بہ سال پیش کی جانے والی تجاویز:

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ دوقومی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم کا تصور بہت پرانا ہے۔دوقومی نظریہ کی روشنی میں برصغیر کی تقسیم کے مبلّغین میں نہ صرف مسلمان بلکہ خود ہندو اور انگریز بھی پیش پیش رہے ہیں۔ذیل میں تقسیم ہند کی تجاویز' جو دوقومی نظریہ کی بنیاد پر پیش کی گئیں' اجمالاً درج کی جا رہی ہیں تا کہ دوقومی نظریے کے نئے جاننے والوں بالخصوص نوجوان نسل کی رہنمائی ہو سکے۔

سلطان شہاب الدین غوری(1401-5ء):

سلطان شہاب الدین غوری نے ہندو مسلم اختلافات کو ہمیشہ کے لیے طے کرنے کا ایک حل نکالا اور ہندو راجہ پرتھوی راج کو تجویز پیش کرتے ہوئے کہا:۔

> ''برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی معرکہ آرائی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا واحد حل یہی ہے کہ برصغیر کو دریائے جمنا کو حدِ فاصل بنا کر اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ مشرقی ہندوستان پر ہندوؤں اور مغربی ہندوستان پر مسلمانوں کا تصرف ہو جائے تا کہ دونوں قومیں امن و امان سے زندگی گزار سکیں''۔

یعنی''ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ پنجاب' سندھ' سرحد' بلوچستان اور کشمیر کا علاقہ مسلمانوں کو دے دیا جائے اور باقی ماندہ

ہندوستان پر ہندو قابض رہیں[8]"۔

مسٹر جان برائٹ(1811ء-1889ء):

مسٹر جان برائٹ نے 1858ء میں حکومتِ برطانیہ کو تجویز پیش کی کہ ہندوستان کو متعدد خودمختار صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے جو بظاہر علیحدہ ہوں لیکن تاجِ برطانیہ کی زیرِ نگرانی ہوں اور یہ برطانوی اقتدار ختم ہونے پر آزاد اور خودمختار ہو سکیں[9]۔

یاد رہے کہ جان برائٹ کی اس تجویز کی اہمیت کے پیشِ نظر قائداعظم محمد علی جناحؒ نے بھی 31 مارچ 1944ء کو فارمین کرسچین کالج کے طلبہ کے استقبالیے سے خطاب کرتے ہوئے' اس کا حوالہ دیا تھا۔

سرسید احمد خان(1817ء-1898ء):

سرسید احمد خان نے 1867ء میں **ہندی اردو تنازع** کے موقع پر بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر سے کہا تھا کہ:۔

"یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو اور مسلمان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ایک کوشش کرنا محال ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو کچھ نہیں' آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں میں جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں' بڑھتا نظر آتا ہے' جو زندہ رہے گا' وہ دیکھے گا۔ مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر مجھے اپنی پیشینگوئی پر یقین ہے[10]"۔

1883ء میں سرسید نے ایک تقریر میں کہا:۔

"فرض کر لیجئے کہ ہندوستان سے تمام برطانوی چلے جاتے ہیں پھر ہندوستان کا حکمران کون ہوگا؟ کیا موجودہ حالات میں ممکن ہے کہ دونوں قومیں برابری کی سطح پر ایک میز پر بیٹھ سکیں گی۔ یقیناً نہیں' اس لیے

ضروری ہے کہ دونوں قوموں میں سے ایک دوسری کو فتح کر لے۔ یہ خواہش کہ دونوں قومیں برابری کی سطح پر رہیں، ناممکن خواہش کی حیثیت رکھتی ہے[11]''۔

ولفریڈ سکوون بلنٹ (1840ء- 1922ء):

ولفریڈ سکوون بلنٹ نے 1883ء میں برطانوی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلے کا حل پیش کیا اور کہا:۔

''ہندوستان کے شمالی صوبے مسلمانوں کو دے دیے جائیں اور جنوبی ہندوستان میں ہندوؤں کی حکومت قائم کر دی جائے[12]''۔

بدرالدین طیب جی (1844ء- 1906ء):

بدرالدین طیب جی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، روشن خیال اور غیر متعصب سیاستدان تھے جو ہندوؤں، مسلمانوں اور پارسیوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ وہ ابتدا میں کچھ عرصہ کانگریس کے صدر بھی رہے لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ مسلمانوں کے ساتھ مسلسل زیادتی ہو رہی ہے۔ جب انہیں دوسری بار کانگریس کی صدارت کی دعوت دی گئی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ 27 اکتوبر 1883ء کو کانگریس کے بانی اے-یو-ہیوم کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں: ''خواہ ہم اس بات کو پسند کریں یا نہ کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت نیشنل کانگریس کی مخالف ہے اور پھر جب مسلمان مجموعی طور پر ایک قوم کی حیثیت سے کانگریس کے خلاف ہوں تو پھر یہ تحریک نہ عوامی حیثیت رکھتی ہے اور نہ ہی اس ادارے کو قومی کانگریس کا نام دیا جا سکتا ہے[13]''۔

مولانا عبدالحلیم شرر (1860ء- 1926ء):

مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے ماہوار رسالے 'مہذب' (لکھنؤ) (ڈاکٹر وحید قریشی اس رسالے کا نام 'تہذیب' لکھتے ہیں، دیکھیے ''پاکستان کی نظریاتی بنیادیں'' لاہور 1973ء)، میں صفحہ 102-116) پر لکھا ہے۔

''حالات کچھ ایسے ہیں کہ کوئی قوم دوسرے فرقے کے جذبات مجروح کیے بغیر مذہبی رسوم ادا نہیں کرسکتی اور نہ عوام میں اتنی رواداری اور صبر کا اتنا مادہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی توہین کو معاف کرسکیں۔ اگر حالات اس حد تک پہنچ چکے ہیں تو دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمان دو صوبوں میں تقسیم کردیا جائے اور آبادی کا تبادلہ کیا جائے۔ ہندوؤں کے رویے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنا ہمسایہ بھی نہ بننے دیں گے چہ جائیکہ وہ اپنے مقدر کی گتھیاں 'مسلم مشرکین' کو سنانا پسند کریں۔ وہ اذان سننے کے بھی روادار نہیں۔ ان حالات میں تقسیمِ ہند کی تجویز مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول ہوگی کیونکہ وہ بھی ہندوؤں سے بیزار دکھائی دیتے ہیں[14]''۔

دو قومی نظریے کی بنیاد پر برصغیر کی تقسیم کی یہ پہلی تجویز ہے جو 1890ء میں پیش ہوئی اور خالص مذہبی بنیادوں پر پیش کی گئی۔ اس میں نہ صرف تقسیم کا مطالبہ تھا بلکہ تبادلۂ آبادی کی تجویز بھی شامل تھی۔

ولایت علی(*..........—1918ء):

ولایت علی ایک معروف وکیل تھے اور ''بمبوق'' کے قلمی نام سے مولانا محمد علی جوہر (1931ء-1878ء) کے انگریزی اخبار ''دی کامریڈ'' میں 'گپ' کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے 10 مئی 1913ء کی اشاعت میں اپنے انٹرویو میں کہا:۔

''ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس طرح علیحدہ ہوجانا چاہیے کہ شمالی ہندوستان مسلمانوں اور باقی ہندوستان ہندوؤں کو دے دیا جائے۔ جبکہ جین اور دوسری قوموں کو ہندوؤں کے ساتھ شامل کردیا جائے[15]''۔

---

* تاریخِ پیدائش نامعلوم۔

چودھری رحمت علی(1897ء-1951ء):

چودھری رحمت علی نے 1915ء میں جیسا کہ انہوں نے خود اپنی کتاب ''پاکستان'' میں لکھا کہ یہ نظریہ سب سے پہلے بزمِ شبلی کے افتتاحی خطبے میں پیش کیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا ہندوستان کا شمالی منطقہ اسلامی علاقہ ہے' اس لئے ہم اسے اسلامی ریاست میں تبدیل کریں گے لیکن یہ اس وقت ہی ہوسکتا ہے جب اس علاقے کے باشندے باقی ہندوستان سے خود کو الگ کریں۔ اسلام اور خود ہمارے لیے بہتری اسی میں ہے کہ ہم یہ علیحدگی جلد سے جلد اختیار کر لیں۔

"Now or Never" (اب یا کبھی نہیں) کے نام سے چودھری رحمت علی نے ایک کتابچے میں لکھا تھا:

> ''میں یہ اپیل ان تین کروڑ مسلمان باشندوں کی جانب سے کررہا ہوں جو ہندوستان کی پانچ شمالی وحدتوں میں رہتے ہیں یعنی پنجاب' سندھ' سرحد' کشمیر اور بلوچستان۔ اس کتابچے میں ان تین کروڑ مسلمانوں کی جانب سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ ان مسلمانوں کو ان کی جداگانہ تاریخ اور مذہبی بنیادوں کے مطابق ایک وفاقی دستور دیا جائے اور ان کی وہ قومی حیثیت تسلیم کی جائے جو ہندوستان کے باقی افراد سے انہیں ممتاز کرتی ہے''[16]۔

بعد از اں 1940ء میں چودھری رحمت علی نے ایک اور پمفلٹ شائع کیا جس میں انہوں نے تقسیمِ ہند کی ایک اور تجویز پیش کی جس کے مطابق ہندوستان میں تین مسلم ریاستیں قائم کرنا تھیں: ایک شمال مغرب میں' دوسری شمال مشرق میں اور تیسری جنوب میں۔

خیری برادران(**عبدالجبار*** ......-1975ء، **عبدالستار*** ......-1945ء)

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ تقسیمِ ہند کی دوسری تجویز خیری برادران کی جانب سے پیش کی گئی

---

* دونوں حضرات کی پیدائش کی تاریخیں معلوم نہیں ہوسکیں۔

جس کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی تھی۔ خیری برادران نے اپنا فارمولا سٹاک ہوم سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ یہ کانفرنس 1917ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس تجویز میں کہا گیا تھا کہ:۔

''حقیقی امن کے قیام کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام محکوم ممالک کو آزاد کر دیا جائے۔ اس کے بغیر جنگ کے بعد بھی امن قائم نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کے لوگوں میں ایسے امور سرانجام دینے کی صلاحیت ہے۔ ہندوستان کو غلام بنائے رکھنے کی یہ دلیل بالکل غلط ہے کہ اس ملک میں کئی مذاہب کے پیروکار اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ آباد ہیں''۔ اس تجویز کے آخر میں کہا گیا کہ:۔

''حق و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بعض مسلم صوبے جن کا وجود ختم کر دیا گیا ہے، پھر قائم کر دیئے جائیں جیسے بنگال، اودھ، سندھ، کرناٹک، مدراس، میسور اور اس ضمن میں دہلی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا[17]''۔

سر سلطان محمد شاہ آغا خان(1877ء- 1957ء):

سر سلطان محمد شاہ آغا خان نے برصغیر کے مسلمانوں کی جو خدمت کی، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آپ مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھے اور برصغیر کی سیاسی صورتحال پر اکثر و بیشتر روزنامہ "The Times" لندن میں مضامین لکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ انہوں نے 1918ء میں ایک مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں یہ ناممکنات میں سے ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک ساتھ زندگی بسر کریں، اس لیے بہتری اسی میں ہے اور ہندو مسلم مسئلہ کا حل بھی یہی ہے کہ ہندوستان کو لسانی، مذہبی، ثقافتی اور نسلی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے[18]۔

نادر علی(*............):

چودہری خلیق الزماں (1889ء-1973ء) کے مطابق 1921ء میں آگرہ کے ایک وکیل نادر علی نے فرقہ وارانہ مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں انہوں نے برصغیر میں ہندو مسلم مسئلہ کا حل پیش کرتے ہوئے لکھا۔ ''ہندوستان کو مذہبی بنیادوں پر ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں تقسیم کردیا جائے''[19]۔

سردار گل محمد خان(1897ء-1957ء):

1922ء میں حکومتِ ہند نے ''برئینز کمیٹی'' قائم کرکے یہ رپورٹ طلب کی کہ صوبہ سرحد کے کچھ اضلاع سابق پنجاب میں ضم کردیئے جائیں تو کیا صورتِ حال ہوگی۔ انجمنِ اسلامیہ ڈیرہ اسماعیل خان کے صدر سردار گل محمد خان نے ایک گواہ کی حیثیت میں پیش ہوتے ہوئے کہا:۔

> ''ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ میرا نظریہ ہے کہ 23 کروڑ ہندوؤں کو جنوب اور 8 کروڑ مسلمانوں کو شمال میں تقسیم کردیا جائے۔ راس کماری سے آگرہ تک کا علاقہ ہندوؤں کو اور آگرہ سے پشاور تک کا علاقہ مسلمانوں کو دے دیا جائے''[20]۔

یہاں یہ بات خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے کہ سردار گل محمد خان نے بھی تقسیم کی بنیاد مذہب یعنی دوقومی نظریے پر رکھی۔

بھائی پرمانند(1874ء-1947ء):

بھائی پرمانند آریہ سماج اور ہندو سنگھٹن کے بہت بڑے حامی تھے اور انہوں نے

---

* تاریخ پیدائش اور وفات نامعلوم۔

1923ء میں آریہ سماج اور ہندو سنگھٹن کی تحریکوں پر کتاب بھی شائع کی۔ اس کتاب میں انہوں نے برصغیر میں ہندو مسلم مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''اس براعظم کو تقسیم کر دیا جائے تا کہ ہندو مسلم مسئلہ ہمیشہ کے لیے طے پا جائے''[21]۔

مولانا عبیداللہ سندھی (1872ء - 1944ء):

مولانا عبید اللہ سندھی ایک غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اسلام کی روشنی نے ان کے دل کو ایسا منور کیا کہ انہوں نے تمام عمر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں گذار دی۔ انہوں نے 1924ء میں ایک کتابچہ بھی شائع کیا جس میں تجویز پیش کی کہ برصغیر کو تین جغرافیائی خطوں میں تقسیم کر دیا جائے اور جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے' ان علاقوں کا اقتدار مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق مولانا نے مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم بھی تسلیم کیا اور اس موضوع پر ایک طویل خط اقبال شیدائی کو لکھا[22]۔

مولانا حسرت موہانی (1881ء - 1951ء):

برصغیر کے بے باک صحافی اور حق گو مسلمان رہنما مولانا حسرت موہانی نے 1924ء میں تجویز پیش کرتے ہوئے برصغیر کے لیے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا اور ہندوؤں کو یقین دلایا کہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے بعد ہندوستان کو ہندو مسلم دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور ان دونوں کو ایک مرکزی نظام سے وابستہ کر دیا جائے گا۔ یہ بڑا اجرأت مندی کا کام تھا کہ اس زمانے میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا نعرہ لگایا جائے اور انگریز کی حکومت کے مکمل خاتمے کا مطالبہ کیا جائے۔ نیز اس طرح انہوں نے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کر دیا اور مسلم و ہندو کو دو الگ قومیں قرار دے دیا۔ مولانا حسرت موہانی نے 1921ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے احمد آباد کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

''تمام مسلمان' ہندوستان میں بحیثیت اقلیت ہیں لیکن فطرت نے اس کا

بدل اس طرح دیا ہے کہ مسلمان تمام صوبوں میں اقلیت میں نہیں' کچھ صوبوں مثلاً کشمیر' پنجاب' سندھ' بنگال' آسام میں مسلمان اکثریت میں ہیں"[23]۔

1924ء میں مولانا حسرت موہانی نے درج ذیل تجاویز پیش کیں:۔

1- مذہبی بنیاد پر آئندہ کی تقسیم کو تسلیم کرلیا جائے۔

2- مسلمان صوبوں کو مسلمان ریاستوں اور ہندو صوبوں کو ہندو ریاستوں میں بدل دیا جائے۔

3- اس طرح ان ریاستوں کی ایک انڈین فیڈریشن قائم کردی جائے اور وفاقی سطح پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک قومی حیثیت قائم کردی جائے[24]۔

مولانا محمد علی جوہر (1878ء-1931ء):

1916ء سے 1923ء کے درمیان ہندو مسلم فسادات میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہا' عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا اور یہ آگ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ اس وقت مولانا محمد علی جوہر ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے داعی تھے۔ مجبوراً انہیں بھی ایک تقریر میں جو انہوں نے 1924ء میں علی گڑھ میں کی' یہ کہنا پڑا: "اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں خونریزی اسی طرح جاری رہی تو ہندوستان ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم ہو جائے گا"[25]۔

مولانا محمد علی جوہر نے کہا "ہندو مسلم ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ یہ کوئی قومی مسئلہ نہیں' لہٰذا اسے بین الاقوامی سطح پر حل کیا جانا چاہیے"[26]۔

انہوں نے اس مسئلے کی مزید وضاحت یوں کی:۔

"ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں دو قومیں رہتی ہیں۔ ہندو اور مسلمان اور ان دونوں کے ایک دوسرے کے بارے میں احساسات ایسے ہیں جیسے کسی فرانسیسی اور جرمن کے جو کہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہوئے

نواب سر قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی (1886ء-1953ء):

قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی انگریزوں کی ملازمت میں تھے لیکن برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی صورتحال کو بخوبی سمجھتے تھے۔ انہوں نے مارچ' اپریل 1920ء میں بدایوں کے ایک اخبار ذوالقرنین میں ہندو مسلم اتحاد کے عنوان سے ایم کے گاندھی کے نام ایک خط لکھا جسے اپنے قلمی نام عبدالقادر بلگرامی کے نام سے شائع کرایا تھا جو بعد میں کتابچے کی شکل میں 1925ء میں علی گڑھ سے ''اوراق گم گشتہ'' میں شائع ہوا جس میں ہندو مسلم مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی تھی اور ہندوستان میں اس مسئلے کے پس منظر پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔ اس میں انہوں نے تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان کو ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کتابچے میں بلگرامی نے مسلمانوں کی اکثریت والے اضلاع کی فہرست بھی دی تھی[30]۔

مرتضیٰ احمد خان میکش: (1899ء-1959ء)

مرتضیٰ احمد خان میکش روزنامہ ''انقلاب'' لاہور کے ایڈیٹوریل سٹاف کے رکن تھے جنہوں نے 1928ء میں ''ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی'' کے عنوان سے بہت سے مضامین لکھے۔ 9 دسمبر 1928ء کی اشاعت میں انہوں نے اپنے مضمون بعنوان ''ہندوستان

باہم مشترک ہیں' جیسا کہ یورپ کی قومیں۔ یہی بنیادی حقائق ہیں جن پر
ہندوستان کی عمارت کھڑی ہے اگر کوئی ایسا آئین اس عمارت پر صحیح طور
پر قائم نہ ہوا تو یہ عمارت زمین بوس ہو جائے گی"[27]۔

لالہ لاجپت رائے (1856ء-1928ء):

مولانا حسرت موہانی کی تجویز کے دُور رَس نتائج سامنے آئے۔ یہاں تک کہ ہندو لیڈروں نے بھی مولانا حسرت موہانی کی تجویز سے متاثر ہو کر ہندوستان کی تقسیم کے فارمولے پیش کیے۔ چنانچہ پنجاب کے مشہور کانگریسی رہنما لالہ لاجپت رائے نے 1924ء میں تقسیمِ ہند کا فارمولا پیش کیا۔ ان کی تجویز کے مطابق ہندوستان کو چار حصوں میں تقسیم کیا جانا تھا جس کے مطابق:۔

ایک حصے میں پورا پنجاب' سندھ' سرحد اور دوسرے حصے
میں مشرقی بنگال' تیسرے میں وہ علاقے جو کسی مسلم صوبے میں شامل نہ
ہوں مگر ان میں مسلمانوں کی اکثریت ہو' جیسے جموں و کشمیر اور مالا بار' ان
علاقوں کو مسلم انڈیا قرار دے دیا جائے۔ چوتھا حصہ باقی ہندوستان پر مشتمل
ہو اور یہ ہندو اکثریت کا علاقہ ہو گا"[28]۔

لالہ لاجپت رائے کی یہ واضح سوچ اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہندو مسلمان دو الگ قومیں ہیں اور دونوں قوموں میں اتحاد نا ممکن ہے۔ اسی دوران لالہ لاجپت رائے نے سی آر داس کو اپنے ایک خط میں لکھا:۔

"میں نے گزشتہ چھ ماہ سے زیادہ اپنا وقت مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے
قوانین پڑھنے میں گزارا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ ہندو مسلم
اتحاد نہ صرف ناممکن ہے بلکہ ناقابلِ عمل بھی"[29]۔

کے مسلمانوں کے لیے وطن کی ضرورت''پر ہندوستان کے سیاسی مسائل کا حل تجویز کرتے ہوئے لکھا کہ:۔

''پنجاب' سندھ' سرحد اور بلوچستان مسلمانوں کے لیے تیار شدہ وطن ہے جہاں ہندوستان کے مسلمان اپنے مذہب' اپنے کلچر' اپنے معاشرے کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکیں اور اپنی زندگی گذار سکیں[32]''۔

ہندوؤں کے مشہور روزنامہ ''پرتاپ' لاہور نے اس مضمون پر شدید نکتہ چینی کی اور لکھا کہ ''برصغیر کے مسلمان ہندوستان میں ایک 'اسلامستان' بنانا چاہتے ہیں اور ہندوؤں کو اس تجویز کے خلاف اکسایا جس پر 9 دسمبر 1928ء کو ''انقلاب'' میں ہی مرتضیٰ احمد خان میکش نے لکھا:۔ ''اگر یورپ میں کوئی اصول لاگو ہوسکتا ہے تو براعظم ہندوستان میں وہی اصول مسلمانوں پر کیوں لاگو نہیں ہوسکتا[33]''۔

ذوالفقار علی خان (1873ء-1933ء):

نواب صاحب ریاست مالیر کوٹلہ کے حکمران خاندان کے ممتاز فرد تھے اور برصغیر کے مسلمانوں کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ان کے ذہن میں مسلمانوں کی آزادی کا واضح تصور تھا جسے انہوں نے 30 دسمبر 1929ء کو لاہور کانفرنس میں پیش کیا۔خلافت کانفرنس میں ان کی تقریر کے اقتباسات برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے ان کی تڑپ کے غماز ہیں:۔

''ہندوستان کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جہاں سات کروڑ افراد پر مشتمل ایسا فرقہ موجود ہو جو مذہب کے اعتبار سے ایک ہو۔کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ اکیس کروڑ افراد کے فرقے کو تو قوم تصور کرلیا جائے' چھ کروڑ اچھوت جو سینکڑوں جاتیوں میں بٹے ہوئے ہیں اور جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ ایک زبان لیکن کیونکہ انہیں مجموعی طور پر ہندو کہتے ہیں' اس لیے انہیں ایک قوم تصور کرلیا جاتا ہے لیکن مسلمان جن میں اخوت کا جذبہ ہے' رنگ و نسل کے امتیاز

سے بالاتر، جن کا طرزِ زندگی ایک نمونہ ہے انہیں محض ایک فرقہ وارانہ گروپ سمجھا جاتا ہے اور ان کی علیحدہ ہستی کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا[34]"۔

مسلمانوں کو ہندوؤں اور انگریزوں پر یہ بات واضح کر دینی چاہیے کہ ہندوستان کا مسئلہ ایک فرقے کا مسئلہ نہیں بلکہ دو مستقل فرقوں کا مسئلہ ہے۔ مسلمانوں کا قتلِ عام تو ہو سکتا ہے اور انہیں ہجرت پر بھی مجبور کیا جا سکتا ہے لیکن سیاسی اعتبار سے نہ تو انہیں دوسری قوموں میں مدغم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی دوسری قوم کی حکمرانی تسلیم کر سکتے ہیں۔

"ہندوستان کی آزادی اور ترقی کا دارومدار اس پر ہے کہ شمالی ہند میں مسلمانوں کو ایسا علاقہ دیا جائے جو دو یا تین صوبوں پر مشتمل ہو یا اسے ایک صوبے میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس علاقے یا صوبے میں مسلمانوں کی آبادی 80% الگ ہو جائے۔ مسلمانوں کے حقوق کی بحالی کی بجائے ایک الگ ملک اور وطن کا مطالبہ کرنا چاہیے[35]"۔

فضل کریم خان درانی(*.........— 1946ء):

فضل کریم درانی کئی ہفت روزہ اخبارات کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون **"ہندوستان میں اسلام کا مستقبل"** کے عنوان سے 1929ء میں لکھا:۔

"میں برس ہا برس سے ایک خواب دیکھ رہا ہوں اور اب وقت آ گیا ہے کہ میں اسے اپنے بھائیوں کے سامنے ظاہر کر دوں۔ یہ خواب ایک مسلم انڈیا کا خواب ہے۔ میں کبھی ہندو مسلم اتحاد پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ ایک وقت تھا جب ہندوستان میں لوگ ہندو مسلم اتحاد کے لیے پاگل ہو رہے تھے لیکن اس وقت بھی میں اس اتحاد کے خلاف تھا۔ دیکھنے اور سوچنے والوں کے لیے گزشتہ دس سالوں میں ایک بات واضح ہو گئی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک علیحدہ ریاست کے سوا کوئی اور چارہ نہیں۔ مسلم انڈیا کی

* تاریخِ پیدائش نامعلوم۔

بات پر ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی سی شکل اختیار کر لی ہے جو کسی طور پر بھی درست نہیں اور ہندوؤں کو اس پر ناراض ہونے کی بھی ضرورت نہیں، وہ مسلمانوں کا کچھ نہیں کر سکتے اگر وہ چاہیں بھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک دوسرے کے مخالف کلچر ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ کسی وقت بھی ان کا آپس میں جھگڑا ہو سکتا ہے، دو مختلف سیاسی نظریات، مختلف مذہبی نظریات کسی طور پر بھی باہم نہیں چل سکتے اور آخرِ کار ایک روز آپس میں لڑ پڑیں گے"۔

"ہندوستان کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ دونوں قوموں میں سے ایک قوم نیست و نابود ہو جائے۔ یا تو مسلمان خودکشی کر لیں اور اپنے آپ کو غائب کر لیں یا قرونِ اولیٰ کے مسلمان اپنا حق چھین لیں۔ اس کے سوا کوئی متبادل طریقہ نہیں ہو سکتا"[36]۔

علامہ محمد اقبالؒ(1877ء-1938ء):

1930ء عظیم تاریخی اہمیت کا سال تھا جب ملک کی تقسیم اور مسلمانوں کے لیے آزاد وطن کے مطالبے نے قومی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ علامہ محمد اقبالؒ نے اپنا نظریہ 30 دسمبر 1930ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے الٰہ آباد کے سالانہ تاریخی اجلاس میں پیش کیا:۔

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے، خواہ یہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومتِ خود اختیاری حاصل کرے، خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی"۔

اس سے پہلے انہوں نے دوقومی نظریہ کے حوالے سے دوٹوک انداز میں بات کرتے

ہوئے کہا:۔

''مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں صرف ایک ہی قوم آباد ہو، وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے، جن کی نسل، زبان، مذہب، سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان کے اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے''[37]۔

علامہ اقبالؒ کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کا ایک علیٰحدہ تشخص ہو اور مسلمان ایک قابلِ قدر قوم کی حیثیت سے اپنی زندگی بسر کریں۔ اس سلسلے میں علامہ اقبالؒ کے نزدیک سب سے بہترین حل یہ تھا کہ مسلمانوں کا ایک علیٰحدہ وطن ہو جہاں وہ اپنے دین اور روایات کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ علامہ اقبالؒ 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس اور 1932ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔ یہاں بھی انہوں نے اپنے اسی موقف کا اعادہ کیا یعنی مسلمان ایک علیٰحدہ تشخص کے حامل ہیں، اس لیے ایک الگ سرزمین ہی ان کی بقا کی ضامن ہو سکتی ہے۔ اس حوالے سے علامہ اقبالؒ کی قائداعظمؒ کے ساتھ بھی خط و کتابت رہی۔ اسی طرح اپنے ایک خط مورخہ 28 مئی 1937ء میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسائل کا بہترین حل یہ ہے کہ ملک کو ایک یا زیادہ ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح مسلمان اسلامی شریعت بھی نافذ کر سکیں گے۔

ڈاکٹر سید ظفر الحسن (1879ء-1949ء) **اور ڈاکٹر سید افضال حسین قادری** (1912ء-1974ء):

علیگڑھ تحریک پاکستان کے ارتقا میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے جسے کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ علیگڑھ کے نہ صرف طلبہ نے بلکہ وہاں کے اساتذہ نے بھی تحریکِ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں جو کردار ادا کیا، وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ علیگڑھ کے دو اساتذۂ کرام نے 1938-39ء میں تقسیمِ ہند کی تجویز اس طرح پیش کی تھی کہ ہندوستان کو چند آزاد ریاستوں میں

تقسیم کر دیا جائے:۔

1- ''پاکستان جو سندھ' سرحد' پنجاب' بلوچستان' ریاست جموں و کشمیر' مالیر کوٹلہ' کپور تھلہ' چترال' دیر' قلات' لوہارو' شملہ اور بہاولپور کی ریاستوں پر مشتمل ہو۔

2- بنگال کو بہار کے ضلع پورنیا اور آسام کی سلہٹ ڈویژن پر قائم کیا جائے۔

3- ہندوستان جس میں بنگال کا باقی حصہ اور دولتِ آصفیہ' حیدر آباد شامل ہو اور حیدر آباد جس میں کرناٹک کا حصہ بھی شامل کر لیا جائے [38]''۔

میجر میاں کفایت علی (اے پنجابی) (1902ء- 1994ء):

میجر میاں کفایت علی نے (اے پنجابی) کے نام سے بہت سی تحریریں شائع کی ہیں۔ انہوں نے 39-1938ء میں انڈستان کے نام سے ایک تجویز پیش کی تھی جسے نواب شاہنواز خان ممدوٹ نے شائع کرایا۔ یہ سکیم پانچ وفاق پر مشتمل تھی۔ دو وفاق مسلمانوں کے اور تین وفاق ہندوؤں کے۔ پہلے میں کپور تھلہ اور مالیر کوٹلہ شامل تھے۔ ان علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 82 فیصد تھا۔ دوسرے وفاق میں مشرقی بنگال' آسام' گوالپار اور سلہٹ کے اضلاع' تری پورہ اور مشرقی بنگال کے آس پاس کے مسلم اکثریت کے علاقے شامل تھے جس میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 66 فیصد تھا۔

ہندوؤں کے تین وفاق میں پہلے وفاق میں سے یوپی' سی پی' بہار' اڑیسہ' آسام' مدراس' بمبئی اور ہندوستان کی کچھ ریاستیں جن میں ہندوؤں کی آبادی 72 تا 83 فیصد تھی۔ دوسرے وفاق میں راجستھان اور وسط ہند کی ریاستیں شامل کی گئی تھیں جن میں ہندوؤں کی آبادی کا تناسب 86 تا 93 فیصد تھا۔ جبکہ تیسرا ہندو وفاق حیدر آباد (دکن) اور میسور کی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ اس میں ہندوؤں کی آبادی کا تناسب 82 تا 88 فیصد تھا لیکن اس سکیم میں جو سب سے بڑا نقص تھا' وہ یہ کہ ان پانچوں وفاق پر مشتمل ایک کنفیڈریشن کا تصور دیا گیا تھا [39]۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف(1891ء - 1971ء):

ڈاکٹر سید عبداللطیف کی تجویز کو منطقوں کی تجویز کا نام دیا گیا کیونکہ انہوں نے 1938-39ء میں برصغیر کو منطقوں کی بنیاد پر تقسیم کرنے کا فارمولا پیش کیا جس کے مطابق مسلمانوں کے لیے پانچ اور ہندوؤں کے لیے گیارہ منطقے قائم کیے گئے یعنی:۔

1- شمال مغربی منطقہ جس میں سندھ' بلوچستان' پنجاب' شمال مغربی سرحدی صوبہ' ریاست خیر پور اور ریاست بہاولپور شامل تھے۔

2- دوسرا منطقہ شمال مشرقی منطقہ کہلائے گا جس میں بنگال اور آسام شامل ہونگے۔

3- تیسرا منطقہ لکھنؤ اور دہلی پر مشتمل ہوگا جس میں یوپی کے علاقے اور بہار کے مسلم اکثریت والے علاقے جو پٹیالہ اور رام پور سے ہوتے ہوئے لکھنؤ تک شامل ہونگے۔

4- چوتھا منطقہ ریاست حیدر آباد (دکن) کرنال' کڑپا' چتوڑ' شمالی ارکاٹ اور چنگل پٹ سے ہوتا ہوا مدراس شہر تک کے علاقے پر مشتمل ہوگا۔

5- پانچویں منطقے میں راجپوتانہ' گجرات اور مغربی ہند میں مسلمان اکثریت والے علاقے پر مشتمل مسلمانوں کے لیے ایک منطقہ بنانے کی تجاویز شامل تھیں[40]۔

سر سکندر حیات(1892ء - 1942ء):

اتحاد پارٹی پنجاب کے لیڈر سر سکندر حیات نے پارٹی کی جانب سے 1938-39ء میں تقسیمِ ہند کی ایک تجویز پیش کی تھی جو ایک کتابچے کی شکل میں شائع ہوئی۔ اس کے مطابق برصغیر کو سات حلقوں میں مندرجہ ذیل طور پر تقسیم کیا گیا تھا:۔

1- آسام' بنگال' ریاست ہائے بنگال اور سکم۔

2- بہار' اڑیسہ' بنگال کے مغربی اضلاع۔

3- صوبہ متحدہ اودھ اور آگرہ۔

4- صوبہ مدراس ریاست ٹراونکور اور کورگ۔

5- بمبئی، حیدرآباد ریاست ہائے مغربی ہندوستان، میسور اور وسطی ہند۔

6- ریاست ہائے راجپوتانہ، گوالیار، مرکزی ہندوستانی ریاستیں، بہار، اڑیسہ، سی پی اور برار۔

7- پنجاب صوبہ سندھ، سرحد، کشمیر اور بلوچستان، بیکانیر اور جیسلمیر پر مشتمل علاقوں کو سات حلقوں میں تقسیم کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن اس تجویز میں یہ کہیں نہیں کہا گیا تھا کہ آیا یہ حلقے کسی وفاق کے تحت ہوں گے یا خودمختار ہوں گے۔ بہرحال تقسیمِ ہند کی یہ ایک تجویز ضرور تھی[41]۔

(اس دوران پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، لاہور کی طرف سے خلافتِ پاکستان کے عنوان کے تحت اور مجلسِ کبیر پاکستان، لاہور کی طرف سے تقسیمِ ہند کی تجاویز بھی سامنے آئیں)

چودھری خلیق الزّماں (1889ء - 1973ء):

چودھری خلیق الزماں، نادر علی وکیل کی اس تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''انہوں نے اپنی تجویز میں نہ تو اعداد و شمار پیش کیے اور نہ ہی مذہبی علاقوں کا تعین کیا کہ وہ کن کن علاقوں میں ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان بنانا چاہتے ہیں[42]''۔

انہوں نے اپنی تجویز 20 مارچ 1939ء میں حکومتِ برطانیہ کو پیش کی جس کے مطابق برصغیر جنوبی ایشیا کو تین فیڈریشنوں میں تقسیم کرنے کی تجویز تھی۔ پہلی فیڈریشن پنجاب، کشمیر، سندھ، بلوچستان پر مشتمل تھی۔ دوسری فیڈریشن بنگال اور آسام، تیسری میں بقایا ہندوستان۔ ریاستوں کے مسئلے کے حل کے لیے تجویز کیا گیا تھا کہ جو ریاست ہندو فیڈریشن میں شامل ہو، وہ ہندوؤں کے ساتھ اور جو مسلم فیڈریشن میں واقع ہو، وہ مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو جائیں گی۔ ہندو اور مسلم فیڈریشن آزاد ہوں گی۔ عبوری دور کے لیے ان کا دفاع ایک علیحدہ ادارے کے سپرد کر دیا جائے جو مجلسِ قانون ساز کے دائرۂ اختیار میں نہ ہو۔ حکومتِ برطانیہ کا اقتدار ختم ہو جانے

کے بعد فیڈ ریشنوں کا دفاع ان کے سپرد کر دیا جائے۔

اسد اللہ سکیم:

1939ء میں پیش کی گئی اسد اللہ سکیم میں مولانا عبد الحلیم شرر کی طرح پورے شمالی ہندوستان کو مسلمانوں کا علاقہ قرار دیتے ہوئے تجویز پیش کی گئی تھی کہ پورے شمالی ہندوستان' جس میں پنجاب' سندھ' بلوچستان' کشمیر' سرحد اور دہلی کے اوپر کا حلقہ شامل تھا مسلمانوں کو' جب کہ جنوبی ہندوستان جو کہ یو پی' بہار' سی پی' مدراس' بمبئی' حیدرآباد اور میسور پر مشتمل تھا' ہندوؤں کو دیا جائے اور مشرقی بنگال آسام اور بہار پر مشتمل علاقہ بھی اسی تجویز کا حصہ تھا[43]۔

سر عبداللہ ھارون(1872ء- 1942ء):

1940ء میں یہ سکیم جس کمیٹی نے پیش کی' اس کے صدر سر عبد اللہ ہارون تھے۔ اس اسکیم کے تحت تجویز کیا گیا تھا کہ برصغیر کو تین وفاقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک وفاق شمال مغرب میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 63 فیصد تھا' دوسرا وفاق شمال مشرق میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 56 فیصد تھا اور تیسرا وفاق باقی ہندوستان[44]''۔

سر فیروز خان نون(1893ء- 1970ء):

سر فیروز خان نون نے 1942ء میں علیگڑھ میں اپنی تقریر کے دوران یہ تجویز پیش کی تھی کہ برصغیر پاک و ہند کو پانچ مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے:۔

1- ''مجوزہ مملکت نمبر ایک پنجاب' سندھ' سرحد اور بلوچستان پر مشتمل ہوگی؛
2- دوسری مملکت آسام اور بنگال پر؛
3- تیسری مملکت صوبہ جات متحدہ بہار' صوبہ متوسط اور اڑیسہ؛
4- چوتھی مملکت صوبہ بمبئی اور
5- پانچویں مملکت صوبہ مدراس پر مشتمل ہوگی[45]''۔

یہ پانچوں آزاد ریاستیں اپنے نمائندوں کے ذریعے وفاق (مرکز) قائم کریں اور

وفاق کے سپرد خارجہ امور اور کرنسی ہو۔ اگر ان مملکتوں میں سے کوئی مرکز کی حکمتِ عملی سے مطمئن نہ ہوتو اسے اختیار حاصل ہوگا کہ وہ مرکز سے علیٰحدگی اختیار کر لے اور اپنے آپ کو جدا کر لے۔

سی آر فارمولا:

8 اپریل 1944ء کو راج گوپال اچاریہ (1879ء-1972ء) نے قائداعظم محمد علی جناحؒ کو ایک طویل خط لکھا جس میں چند اہم نکات پیش کیے۔ یہی نکات بعد میں سی آر فارمولا کے نام سے مشہور ہوئے جو مندرجہ ذیل ہیں:۔

1- ''مسلم لیگ برصغیر کی آزادی کی حمایت کرے گی اور عبوری دور کے لیے ہندوستان میں حکومت بنانے میں کانگریس کا ساتھ دے گی؛

2- اختتامِ جنگ کے بعد شمال مغرب اور مشرقی اضلاع میں جہاں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی' حد بندیوں کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ اس طرح حدود کے تعین کے بعد جو علاقے اندرونِ حدود ہوں گے' وہاں کے تمام باشندوں کی رائے حاصل کی جائے گی۔ استصوابِ رائے میں جو نتیجہ برآمد ہوگا' وہ اس طرح آخری فیصلہ تصور کیا جائے گا کہ ان علاقوں کو ہندوستان سے الگ کیا جائے یا نہیں۔ سرحدوں پر جو اضلاع واقع ہوں گے' ان کو حق حاصل ہوگا کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرلیں؛

3- ہر دو جماعتوں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ کو استصوابِ رائے سے قبل اپنے اپنے خیالات عوام کے سامنے پیش کرنے کا موقع فراہم کیا جائے گا؛

4- علیٰحدگی کے وقت باہمی رضامندی سے دفاع' مواصلات' تجارت اور دوسرے امور طے کرنے کے لیے معاہدہ کیا جائے گا؛

5- آبادی کے تبادلے میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہوگا۔ ہر شخص اپنی ہی رضا کا پابند ہوگا؛

6- یہ سارے امور صرف اس صورت میں قابلِ قبول ہوں گے جبکہ ہندوستان کو حکومتِ برطانیہ پورے اختیار اور ذمہ داریاں منتقل کر دے[46]"۔

یہ فارمولا قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں پیش کرنے کے بعد جواب دینے کا وعدہ کیا جس پر راج گوپال اچاریہ تیار نہ تھے اور چاہتے تھے کہ قائداعظمؒ مجلس عاملہ سے اس بارے میں رائے نہ لیں جس پر یہ تجویز خود بخود ختم ہو گئی۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876ء- 1948ء):

برصغیر جنوبی ایشیا میں علامہ اقبالؒ نے قومیت کے اس نظریے کو اُجاگر کیا جو مسلمانوں کے لیے ایک آزاد اور خودمختار مملکت کے حصول کی بنیاد قرار دیا گیا:۔

اسی نظریے کی بات آگے بڑھاتے ہوئے قائداعظمؒ نے 22 مارچ 1940ء کو لاہور میں ہونے والے مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس کے خطبۂ صدارت میں برملا کہا کہ:

"قوم کی خواہ کوئی بھی تعریف کی جائے، مسلمان اس تعریف کے مطابق ایک قوم ہیں اور ان کا اپنا وطن، ان کا اپنا علاقہ اور اُن کی اپنی مملکت ضرور ہونی چاہیے۔ ہم ایک آزاد و خودمختار قوم کی حیثیت سے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ امن و اتفاق کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اپنی پسند اور امنگوں کے مطابق اور اپنے معیار اور نصب العین کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی روحانی، ثقافتی، اقتصادی، سماجی اور سیاسی زندگی کو بہترین اور بھرپور طریقے پر ترقی دے سکے[47]"۔

بعد ازاں ایسوسی ایٹڈ پریس امریکہ سے یکم جولائی 1942ء کو بات کرتے ہوئے انہوں نے دوقومی نظریے کو اس طرح بیان کیا:۔

"ہم مسلمان اپنی تابندہ تہذیب اور تمدن کے لحاظ سے ایک قوم ہیں۔ زبان اور ادب، فنونِ لطیفہ، فنِ تعمیر، نام اور نام رکھنے کا طریقہ، اقدار اور تناسب کا شعور، قانونی اور اخلاقی ضابطے، رسوم اور جنتری، تاریخ اور روایات، رجحانات اور اُمنگیں، ہر ایک لحاظ سے ہمارا اپنا انفرادی زاویۂ نگاہ اور

فلسفۂ حیات ہے۔بین الاقوامی قانون کی ہر تعریف کے مطابق ہم ایک قوم ہیں[48]''۔

3 جولائی 1943ء کو آپ نے ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ''یہ محض مذہبوں کا فرق نہیں ہے کیا تمہاری ثقافت مشترک ہے؟ کیا تمہاری معاشرتی زندگی مشترک ہے؟ کیا تمہارا قانون مشترک ہے؟ آخر ہندوؤں اور مسلمانوں میں کیا چیز مشترک ہے؟[49]''۔

ایڈورڈ کالج پشاور میں 27 نومبر 1945ء کو قائد اعظمؒ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

''ہم دونوں قوموں میں فرق صرف مذہب کا نہیں بلکہ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین' ہمارا ضابطۂ حیات الگ ہے جو ہماری زندگی کے ہر شعبے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے[50]''۔

اس سے پہلے 14 اپریل 1941ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس کے موقع پر قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔

''مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات یا ملی تشخص کو مٹانے کے لیے جو کوشش بھی کی جائے گی' اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے ہی دم لیں گے[51]''۔

قائد اعظمؒ نے اپنے اس دعوے کو اس شدومد سے دہرایا کہ مخالفین بھی اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔چنانچہ آل انڈیا کانگریس کے ممتاز رکن این سی دَت نے اپنے کھلے خط میں جو یکم فروری' 1940ء کو بجنور سے شائع ہونے والے ایک اخبار''مدینہ'' میں شائع ہوا' لکھا:''ان حالات میں ہندو مسلم تصفیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ قومیں مان لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ

ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دیا جائے''۔

دو قومی نظریہ – مسلمانوں کی ترقی کا ضامن:

دوقومی نظریے کا تعلق صرف برصغیر سے ہی نہیں ہے۔ یہ نظریہ پورے کرۂ ارض سے عبارت ہے۔ اس نظریے کے تحت ہم دنیا کو مسلم اور غیر مسلم دنیا میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ جغرافیائی عناصر سے یہ ممکن ہے کہ ملّتِ اسلامیہ دوسری اقوامِ عالم کی ہم زبان، ہم وطن، ہم نسل ہو جائے لیکن ہم اسے ان اقوام کا ''جزو'' قرار نہیں دے سکتے۔ مثلاً امریکہ، چین، روس وغیرہ میں رہنے والوں کو ہم امریکی، چینی، روسی تو کہہ سکتے ہیں لیکن ان ممالک میں رہنے والے مسلمان ملّتِ اسلامیہ کا لازمی جز وہی رہیں گے۔ عرب ممالک میں عیسائی اور یہودی ہزاروں سال سے باہم ایک جگہ رہنے کے باوجود ایک قوم نہیں بن سکے۔

اسی حقیقت کے پیشِ نظر قائد اعظمؒ نے قیامِ پاکستان کے بعد بھی دوٹوک انداز میں بات کرتے ہوئے 25 اکتوبر 1947ء کو ایک غیر ملکی نامہ نگار مسٹر ہوپر سے کہا کہ:۔

''جہاں تک دوقومی نظریے کا تعلق ہے، یہ محض ایک نظریہ ہی نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اسی حقیقت کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ اور باتوں سے قطع نظر اس حقیقت کی تصدیق حکومتِ ہندوستان کے اس اقدام سے بھی ہوتی ہے کہ اس نے پاکستان سے ہندوؤں کو نکالنے کی کوشش کی ہے۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر میں صرف ایک قوم رہتی ہے۔ کچھ اور واقعات وحالات بھی ایسے ہو رہے ہیں جو اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہندوستان کی مملکت ایک ہندو مملکت ہے''[52]۔

دو قومی نظریہ اور ہندوؤں کی تنگ نظری:

عقیدے اور مذہب کی حیثیت سے ہندو مذہب مبہم اور غیر معین پہلو رکھتا ہے۔ ہندو دنیا کی پست ہمت، عسکری روایات سے محروم واحد قوم ہے جس میں شجاعت و بہادری کی بجائے تعصب، کینہ پروری اور تنگ نظری کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اہلِ ہند کو حکمرانی کے

بہت سے مواقع ملے مگر وہ سازگار ماحول کے باوجود کوئی اچھا تاثر قائم نہ کر سکے۔ صدیوں کی غلامی نے ان کا قومی کردار ہی تباہ کر دیا تھا۔ گائے کے تقدس اور دیگر جانوروں کی حرمت کے غیر فطری جذبات نے ان کی ترقی کی راہیں مسدود کر دی تھیں۔ دوسری طرف چھوت چھات اور ذات پات کے امتیاز نے ان میں برتری کے احساسات کو جنم دیا جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنی ہی قوم کے ادنیٰ کام کرنے والوں یعنی شودروں کو نہ صرف سماجی بلکہ بنیادی حقوق سے بھی محروم کر دیا۔

دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں' ان کی بنیاد اخوت اور انصاف پر ہے مگر ہندو وازم درجہ بندی' عدم مساوات اور تقسیمِ انسانیت پر مبنی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ برصغیر کبھی متحد نہیں رہا۔ اگر چہ ہندو قائدین تاریخی حقائق کے برخلاف اپنے مذموم عزائم کے حصول کی تکمیل کے لیے اسے ''گاؤ ماتا'' سے تشبیہ دے کر گمراہی پھیلاتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند زمانہ قدیم سے کئی ٹکڑوں میں تقسیم چلا آتا ہے۔ یہاں کے اصل باشندوں کو شمال سے آنے والے حملہ آوروں نے جنوب کی طرف بھگا دیا اور خود اس سرزمین پر ''ہندو'' کے نام سے مسلّط ہو کر اپنی نسلی برتری برقرار رکھنے اور اپنی قیادت کو دوام دینے کے لیے انسانیت کی اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ بندی کرتے ہوئے معاشرے کو چار غیر انسانی طبقوں میں تقسیم کر دیا۔

برصغیر میں مسلمانوں نے اپنی آمد کے بعد گروہی' سماجی اور طبقاتی تقسیم ختم کر کے برصغیر کو ایک وحدت میں بدلنے کا فریضہ انجام دیا۔ اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں صوفیائے کرام نے بے پایاں خدمات انجام دیں جس کے نتیجے میں برصغیر کی پوری معاشرت اور تمدن پر حیرت انگیز مفید اثرات مرتب ہوئے۔ ایک ہزار سالوں پر محیط طویل دورِ حکومت کے باوجود برصغیر میں مسلمان ایک اقلیت ہی رہے اور اسلامی حکومتوں کے پایۂ تخت دہلی' آگرہ' لکھنؤ وغیرہ میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔

برصغیر میں مسلمانوں پر سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے ہندوؤں کے عزائم نے مسلمانوں

میں باہمی اتحاد' جداگانہ قومی تشخص کے مفید جذبات اور تحریکوں کو جنم دیا۔ ہندوؤں نے ان تحریکوں کی بھرپور مزاحمت کی۔ مسلمان اپنے تمدن' معاشرتی اقدار اور مذہب کو خطرات میں گھرا ہوا محسوس کرتے تھے۔ وہ اپنا تحفظ چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے تحت الشعور میں اپنے تحفظات کے جو جذبات پرورش پا رہے تھے' انہیں حصولِ پاکستان کے بے نام تصور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے کے معاندانہ ہندو رویے نے مسلمانوں کو اپنے ملی تشخص کے تحفظ کے لیے وسیع تر قومی مفاد میں قائداعظمؒ کی فقید المثال قیادت میں متحد ہونے پر مجبور کر دیا۔ مسلمان قوم نے ہر قسم کے فروعی اور گروہی اختلافات بھلا دیئے اور قوم ایک جسدِ واحد بن کر اُبھری۔

تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں یہ نکتہ بہت اہمیت کا حامل ہے کہ وہ صوبے جہاں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور ان کو یہ یقین تھا کہ ان کے علاقے پاکستان کا حصہ نہیں بن سکیں گے' پھر بھی انہوں نے دوسرے مسلمانوں کا بھرپور ساتھ دیا۔

دوقومی نظریہ تحریکِ پاکستان کی رُوح اور قیامِ پاکستان کی بنیاد ہے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ پاکستان کو اسلام کی عملی تجربہ گاہ بنانا چاہتے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ پاکستان اتحادِ عالمِ اسلام کا داعی بنے اور مسلم ممالک کو متحد کرے۔

دوقومی نظریہ............جس کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا' اگر ہم تحقیقی جائزہ لیں تو کشمیر' فلسطین اور افریقی ممالک کے مسائل کا حل صرف اسی دوقومی نظریے کی رُوح کو سمجھنے سے ہو سکتا ہے اور دوقومی نظریہ ہی تمام مسلمانوں کی ترقی کا ضامن ہے۔

حوالہ جات

1- دی نیو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا' جلد 11' ایڈیشن پندرہواں' شکاگو' 1998ء' ص 918

2- اشتیاق حسین قریشی' ڈاکٹر۔ نظریہ پاکستان کے تاریخی' سیاسی اور معاشرتی پہلو' نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن' لاہور' 1999ء' ص 12

3- ڈیوڈ رابرٹسن' دی پینگوین ڈکشنری آف پولیٹکس' پینگوین گروپ' 27 رائٹس لین لندن' 1993ء

4- نہرو' جواہر لال' این آٹو بائیوگرافی' لندن' 1936ء

5- نہرو جواہر لال' دی ڈسکوری آف انڈیا' نیویارک' 1946ء

6- 'کاسٹ اِن انڈیا' جے' ایچ ہٹن' بمبئی' 1961ء' ص 50

7- کتاب الہند' مترجم سید اصغر علی' الفیصل' لاہور' 1994ء' ص 6

8- تاریخ فرشتہ' جلد اوّل' ص 238

9- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ کراچی' 1968ء؛ ص 3؛ مزید دیکھیے: سلیکٹڈ سپیچز آف جان برائٹ آن پبلک کوسچن' جے ایم ڈینٹ اینڈ سنز لمیٹڈ' لندن ص۔ 14؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص 7

10- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ کراچی' 1968ء ص 3؛ مزید دیکھیے: حیاتِ جاوید' مولانا الطاف حسین حالی' لاہور ص 94؛ ماڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان' ایس۔ ایم۔ اکرام' انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر' 2 کلب روڈ' لاہور؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص 13-14؛ تحریکِ آزادی' صلاح الدین ناسک' لاہور' ص 159

11- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ کراچی' 1968ء ص 3؛ مزید دیکھیے: حیاتِ جاوید' مولانا الطاف حسین حالی' لاہور ص 94؛ ماڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان' ایس۔ ایم۔ اکرام' لاہور؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل'

کے کے عزیز'لاہور'ص13' 14؛تحریکِ آزادی'صلاح الدین ناسک'لاہور'ص 159

-12 اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص38؛ مزید دیکھیے :انڈیا انڈر ریپون' اے پرائیویٹ ڈائری' ڈبلیو' ایس بلنٹ' لندن 1909ء ص107' 108

-13 ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان'ڈاکٹر عبدالسلام خورشید' نیشنل بک فاؤنڈیشن' 1977ء ص 19

-14 دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ کراچی'1968ء؛ ص4؛مزید دیکھیے : کاروانِ صحافت' عبدالسلام خورشید'لاہور' 1964ء؛ ص67؛اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلداوّل' کے کے عزیز'لاہور' ص42'43؛اوریجن آف پاکستان' عبدالسلام خورشید'ٹی'پی'ٹی' 1962ء

-15 اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلداوّل' کے کے عزیز'لاہور'ص 85؛مزید دیکھیے : دی انٹرویو'بمبوق' کامریڈ'10 مئی'1913ء

-16 دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ کراچی'1968ء ص7؛مزید دیکھیے :پری لیوڈ ٹو پاکستان (1940ء-1930ء)' جلداوّل' کے کے عزیز'لاہور' ص153-149؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلداوّل' کے کے عزیز لاہور' ص86؛ دی فادرلینڈ آف دی پاک نیشن'چودہری رحمت علی' کیمبرج' اشاعت سوم' 1947ء؛ ص213' 214

-17 دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ کراچی'1968ء ص4؛مزید دیکھیے :پروسیڈنگز سا کس ہوم کانفرنس آف سوشلسٹ انٹرنیشنل' ص407'408؛پری لیوڈ ٹو پاکستان (1940ء-1930ء)' جلد دوم' کے کے عزیز' لاہور' ص' 576'577؛اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلداوّل' کے کے عزیز'لاہور' ص-89

-18 اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلداوّل' کے کے عزیز'لاہور'ص157 ؛مزید دیکھیے :

اے کانسٹی ٹیوشن فار انڈیا' گروینگ آف فری سٹیٹس' دی باوریاں ماڈل' سرآغا خان' مطبوعہ دی ٹائمز' 13 اکتوبر 1928ء؛ انڈیا ان ٹرانزیشن' اے سٹڈی ان پولیٹیکل ایوولیوشن' آغا خان' لندن' 1918ء' ص 37؛ پری لیوڈ ٹو پاکستان (1940ء-1930ء)' جلد دوم' کے کے عزیز' لاہور' ص 76' 77؛ دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء' ص 5

19- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص 111؛ مزید دیکھیے: پاتھ وے ٹو پاکستان' خلیق الزماں' لاہور 1961ء' ص 238

20- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء' ص 5؛ مزید دیکھیے: رپورٹ آف دی نارتھ ویسٹ فرنٹیر انکوائری کمیٹی' 1924ء' ص 122؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص 116

21- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء' ص 5؛ مزید دیکھیے: اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص 80؛ ہندو نیشنل موومنٹ' بھائی پرمانند' لاہور' 1929ء اور سٹوری آف مائی لائف' طبع ثانی' لاہور' 1937ء

22- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص 117؛ افادات و ملفوظاتِ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی' محمد سرور' لاہور' 1972ء' ص 144

23- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء' ص 5؛ رپورٹ آف دی نارتھ ویسٹ فرنٹیر انکوائری کمیٹی' 1924ء' ص 122؛ پری لیوڈ ٹو پاکستان' جلد دوم' کے کے عزیز' لاہور' ص 358' 359؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص 113؛ انڈین اینوئل رجسٹر' 1922ء' ص 403' 404

24- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء' ص 5؛ مزید دیکھیے: رپورٹ آف دی نارتھ ویسٹ فرنٹیر انکوائری کمیٹی' 1924ء' ص 122؛ پری

لیوڈ ٹو پاکستان' جلد دوم' کے کے عزیز' لاہور' ص358,359؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص113؛ انڈین اینوئل رجسٹر' 1922ء' ص403' 404

25- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء ص6؛ مزید دیکھیے: دی کامریڈ (دہلی) 5 جون' 1925ء؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص73

26- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء ص6؛ مزید دیکھیے: دی کامریڈ (دہلی) 5 جون' 1925ء؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص73

27- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء ص6؛ مزید دیکھیے: دی کامریڈ (دہلی) 5 جون' 1925ء؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص73

28- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص145؛ مزید دیکھیے: 30 نومبر' اور 5' 14 اور 17 دسمبر 1924ء کو ٹربیون' لاہور میں شائع ہونے والے ان کے مضامین؛ دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء ص5

29- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص145؛ مزید دیکھیے: 30 نومبر' اور 5' 14 اور 17 دسمبر 1924ء کو ٹربیون' لاہور میں شائع ہونے والے ان کے مضامین؛ دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء ص5

30- ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' ڈاکٹر عبدالسلام خورشید' ص48؛ مزید دیکھیے: اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اول' کے کے عزیز' ص99

31- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد اوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص156؛ مزید

دیکھیے: تعمیرِ پاکستان اور علمائے ربانی، منشی عبدالرحمان خاں، ملتان، 1956ء، ص48؛ ''حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور آل انڈیا مسلم لیگ'' ''مطبوعہ''البلاغ'' فروری 1970ء، ص29

32- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلداوّل، کے کے عزیز، لاہور، ص167، 168؛ مزید دیکھیے: اوریجن آف پاکستان، ٹرینڈز دیٹ لیڈ ٹو پارٹیشن، عبدالسلام خورشید، دی پاکستان ٹائمز، 23مارچ 1962ء؛ صحافت پاکستان اور ہند میں، عبدالسلام خورشید، لاہور، 1963ء ص451؛ مرتضیٰ احمد خان میکش کے مضامین بعنوان ''ہندی مسلمان کے لیے الگ وطن'' میکش کا ایک اور مضمون ''پاکستان کا بانی کون؟'' مشرق (روزنامہ) کیم اپریل 1964ء

33- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلداوّل، کے کے عزیز، لاہور، ص167، 168؛ مزید دیکھیے: اوریجن آف پاکستان، ٹرینڈز دیٹ لیڈ ٹو پارٹیشن، عبدالسلام خورشید، دی پاکستان ٹائمز، 23مارچ 1962ء؛ صحافت پاکستان اور ہند میں، عبدالسلام خورشید، لاہور، 1963ء ص451؛ مرتضیٰ احمد خان میکش کے مضامین بعنوان ''ہندی مسلمان کے لیے الگ وطن'' میکش کا ایک اور مضمون ''پاکستان کا بانی کون؟'' مشرق (روزنامہ) کیم اپریل 1964ء۔

34- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلداوّل، کے کے عزیز، لاہور، ص176-171؛ مزید دیکھیے: آل انڈیا خلافت کانفرنس، لاہور کا خطبۂ استقبالیہ جو نواب سر ذوالفقار علی خان نے 31دسمبر 1929ء کو دیا، لاہور، ص26-15)، دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص6؛ اوریجن آف دی آئیڈیا فار سپریٹ مسلم سٹیٹ، افضل، رفیق، ص189

35- اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان، جلداوّل، کے کے عزیز، لاہور، ص176-171؛ مزید دیکھیے: آل انڈیا خلافت کانفرنس، لاہور کا خطبۂ استقبالیہ جو نواب سر ذوالفقار علی خان نے 31دسمبر 1929ء کو دیا (مطبوعہ گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور، ص26-15)؛ دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی، 1968ء، ص6؛ اوریجن آف دی آئیڈیا فار سپریٹ مسلم سٹیٹ، افضل، رفیق، ص189

36- پری لیوڈ ٹو پاکستان' جلداول' کے کے عزیز' لاہور' ص 106-78؛ مزید دیکھیے: اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلداوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص 162؛ دی فیوچر آف اسلام اِن انڈیا' ایف کے درانی' لاہور' 1929ء' ص 12

37- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء ص 6' مزید دیکھیے: خطبۂ الٰہ آباد 1930ء محکمۂ فلم ومطبوعات' وزارتِ اطلاعات ونشریات' حکومتِ پاکستان' اسلام آباد' ص 14؛ مزید دیکھیے: اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلداوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص 193؛ آل انڈیا مسلم لیگ' الٰہ آباد سیشن' دسمبر 1930ء صدارتی خطبہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ لاہور' ص 1

38- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء ص 11؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلداوّل' کے کے عزیز' لاہور' ص 592-593

39- دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' **1968**ء ص **11**

مزید دیکھیے: پری لیوڈ ٹو پاکستان (1930ء-1940ء)' جلددوم' کے کے عزیز' لاہور' ص 531-535

40- پری لیوڈ ٹو پاکستان (1930ء-1940ء)' جلداول' کے کے عزیز' لاہور' ص 443-454؛ مزید دیکھیے: دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء ص 10

41- پری لیوڈ ٹو پاکستان (1930ء-1940ء)' جلددوم' کے کے عزیز' لاہور' ص 539-545؛ مزید دیکھیے: دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء ص 10؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلددوم' کے کے عزیز' لاہور' ص 560

-42 دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء ص 7؛ مزید دیکھیے: ''انڈین کانسٹی ٹیوشنل پرابلمز''. ان مائنٹینتھ سنچری' 1939ء ص 292' 293؛ اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد دوم' کے کے عزیز' لاہور' ص 487' 488

-43 پری لیوڈ ٹو پاکستان (1940ء-1930ء)' جلد دوم' کے کے عزیز' لاہور' ص 592' 593

-44 دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء ص 13؛ مزید دیکھیے: اے ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' جلد دوم' کے کے عزیز' لاہور' ص 608

-45 پری لیوڈ ٹو پاکستان (1940ء-1930ء)' جلد دوم' کے کے عزیز' لاہور' ص 956' 957

-46 ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان' ڈاکٹر عبدالسلام خورشید' ص 143

-47 دی پاکستان ریزولیوشن اینڈ دی ہسٹورک لاہور سیشن' سید شریف الدین پیرزادہ' کراچی' 1968ء ص 51-35؛ مزید دیکھیے: ری پروڈیوس بائی ڈاکٹر اشرف ان پاکستان' ص 106-100؛ پری لیوڈ ٹو پاکستان (1940ء-1930ء)' جلد دوم' کے کے عزیز' لاہور' ص 913-910

-48 سپیچز' سٹیٹمنٹس اینڈ میسیجز آف دی قائداعظمؒ' جلد سوم' خورشید احمد خان یوسفی' بزمِ اقبالؒ' لاہور' 1996ء ص 1578

-49 ایضاً- ص 1590

-50 ایضاً- ص 2124

-51 ایضاً- ص 1386

-52 ایضاً- 1996ء ص 2633